باغِ تازہ

نقوی مصطفےٰ آبادی

باغِ تازہ

شوقِ فضول و جرأتِ رندانہ دیکھنا
اک باغِ تازہ اور کھلایا ہے دوستو

نقوی مصطفےٰ آبادی

انھوں نے اپنے پہلے مجموعے سے جس چمن کو جگایا تھا وہ باغِ تازہ میں مزید نکھر سنور بلکہ بار آور ہو کر سامنے آیا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ یہ مجموعہ ادیبوں اور دانشوروں کے علاوہ مختلف طبقات کے صاحبانِ ذوق کے لیے بھی اچھا ارمغان ثابت ہوگا۔

شبیہہ الحسن

۱۰ اگست ۱۹۷۷ء

○

دل ہمارا لے کے دلداری کرو
پھر سے تم اِس رسم کو جاری کرو

پہلے گھر کو تو بنا ڈالو چمن
دشت میں پھر جا کے گلکاری کرو

بجلیاں تم پر گریں، گرتی رہیں
تم برابر اُن کی غم خواری کرو

اک فسانہ ہے فقط یہ جُوئے شیر
جُوئے خوں تم آنکھ سے جاری کرو

پھر سجی ہے بزمِ کیدِ اہرمن
حکمتِ یزداں سے پھر یاری کرو

اِک تغافُل کیش سے ہے واسطہ
دوستو! مرنے کی تیاری کرو

داغ کھاؤ اشرفی کے برملا
گدیاگر بن کر بھی زرداری کرو

کہہ چکا ہے غالبِ آشفتہ سر
غم غلط کرنے کو مے خواری کرو

نقویؔ دلدادۂ جاں باختہ
آئیں گے وہ دل نہ تم بھاری کرو

۱۹ ر لغایۃ ۲۰ ر فروری ۷۵ء

○

دیدۂ گریاں دیکھ رہے ہیں
خود کو پشیماں دیکھ رہے ہیں

زلفِ پریشاں دیکھ رہے ہیں
گردشِ دوراں دیکھ رہے ہیں

خوابِ پریشاں کی تعبیریں
کاکلِ پیچاں دیکھ رہے ہیں

بکھری زلفیں، آنکھ میں آنسو
ابرِ نیساں دیکھ رہے ہیں

دیکھ نہیں سکتے ہیں پھر بھی
دیدۂ حیراں دیکھ رہے ہیں

چلمن میں بے تاب ہیں نظریں
یوسفِ زنداں دیکھ رہے ہیں

صبحِ بہاراں کے وعدے تھے
"شامِ غریباں دیکھ رہے ہیں"

نظریں ملتے ملتے پلٹیں
رگ رگ پیکاں دیکھ رہے ہیں

یاد رہے گی تیری خلش بھی
خارِ مغیلاں دیکھ رہے ہیں

خنداں خنداں دیکھنے والے
"حیراں حیراں دیکھ رہے ہیں"

اُن کا دامن میرے آنسو
"چاک گریباں دیکھ رہے ہیں"

کاکل برہم دوش ہوا پر
ابرِ خراماں دیکھ رہے ہیں

بستی والو میرا رستہ
دشت و بیاباں دیکھ رہے ہیں

نقوی تو بھی خوب ہے پیارے
تجھ کو خوباں دیکھ رہے ہیں

۹ مارچ ۷۵ء

○

اے دوست جُدائی کا اب کوئی مُداوا دے
یا آتشِ ہجراں کو کچھ اور بھی بھڑکا دے

اے بحرِ سخا، آخر کب تک یہ غلط بخشی
صحرا کو مِلے قطرہ اور ذرّے کو دریا دے

وہ غنچہ دہن بولے کچھ منہ سے کہ مت بولے
اے بادِ صبا میرا پیغام تو پہنچا دے

انگور کا رس پی کر تسکین نہیں ہوتی!
تپتے ہوئے ہونٹوں سے تپتی ہوئی صہبا دے

آغازِ محبت کیا تمہیدِ خرابی ہے
اے ترکِ جفا پیشہ ہاں کچھ تو اشارا دے

ناکام تمنا سے اب کام کی باتیں کر
اے حسنِ بہانہ جو مت کل کا بھلاوا دے

ہم عشق کے ماروں کے انداز نرالے ہیں
دیکھو تو بہت اُلجھے سمجھو تو بہت سادے

اُس وعدۂ فردا کا کیا خاک یقیں آئے
ہر صبح شبِ غم کو جو اور بڑھاوا دے

نقوی جسے خود اپنی نظروں پہ نہ ہو قابو
گستاخ نگاہی کی وہ تجھ کو سزا کیا دے

۲۰/۲۳ مارچ ۷۵ء

○

چاکِ دل، چاکِ جگر، چاکِ گریباں کتنے
تم سلامت رہو، ہیں شغل کے ساماں کتنے

سازِ عشرت تو بہت بجتے ہیں ہر سُو لیکن
بزمِ غم سجنے کو ہیں دیدۂ گریاں کتنے

کوئی یوسف نہ ہو، بازار بھی لگ جائے گا
ہیں زلیخا سے یہاں چاک گریباں کتنے

داغِ دل، داغِ جگر، داغِ تمنا یعنی
دیکھو تو، ہم نے کھلائے ہیں گلستاں کتنے

کیا یہ کم ہے کہ اجازت ہے لہو رونے کی
ہم سے کیوں پوچھو ہیں احسانِ بہاراں کتنے

اپنے ہر نالے پہ گلچیں کا جگر چاک ہوا
بلبلو! ہم سے چمن میں ہیں غزلخواں کتنے

اب تو زنجیر کی جھنکار سے دل بہلے گا
کیا کہوں، قطع کیے ہیں نے بیاباں کتنے

بوالہوس، آبلہ پائی کے مزے کیا جانیں
اُن کے تلووں میں چبھے خارِ مغیلاں کتنے

طعن و تشنیع و ملامت سے نہ بدلا نقوی
پُوچھو واعظ سے ہیں اب اور نمکداں کتنے

یہ غزل تقریباً دس دن میں تمام ہوئی۔
نقوی

۱۳ر اپریل ۷۵ء

○

تعزیرِ جرمِ عشق خطا کار کے لیے
کافی ہے ایک عمر کو پندار کے لیے

جانِ عزیز چھوڑ تو وقف ضرور ہے
آنا ہے اُن کو آخری دیدار کے لیے

نقشِ قدم کو آپ مٹاتے ہوئے چلیں
پھر بھی بہت ہے رشک گنہگار کے لیے

کم ظرفیٔ نگارِ تمنّا تو دیکھیے
تلچھٹ رکھا ہے ظرفِ قدح خوار کے لیے

شائستہ سزائے محبت نہیں کوئی
بے تاب گو ہیں سب رسن و دار کے لیے

جوشِ جنونِ عشق نے زنداں دکھا دیا
نکلے تھے کتنے شوق سے گلزار کے لیے

نقوؔی علاجِ دردِ فراواں تو ہو چکا
اب کچھ دعا ہو لذتِ آزار کے لیے

۱۳/۱۵ اپریل ۷۵ء

حرفے چند

اکتوبر ۱۹۷۴ء میں میری غزلوں کا پہلا مجموعہ "چمن جاگے" کے نام سے شائع ہوا — اس میں ۱۰ جون ۱۹۷۴ء تک کی غزلیں شامل ہیں — اور اب یہ دوسرا مجموعہ "باغِ تازہ" شائع ہو رہا ہے پہلے مجموعہ کی اشاعت تمام و کمال میں نے اپنے مصارف سے کی اور اب یہ بھی بغیر استعانتِ غیرے بفضلہٖ منصۂ شہود پر آ رہا ہے "چمن جاگے" پر اُردو اکیڈمی نے مبلغ پانچ سو روپے کا انعام دے کر خسارہ کسی حد تک کم کر دیا جس کے لیے اکیڈمی کا ممنون ہوں۔ میں نے اپنی کتاب کی فروخت میں قطعاً دلچسپی نہیں لی۔ نتیجہ یہ ہے کہ تین سو جلدیں بکس میں بند ہیں اور دو سو کے لگ بھگ احباب میں تقسیم کر دیں — سوال اُٹھتا ہے کہ جب "چمن جاگے" کو فروخت نہ کیا گیا اور خسارہ باقی رہا تو اس کے بعد "باغِ تازہ" کی اشاعت آخر کیوں؟ جواب مجھ سے بہت پہلے غالب دے چکے ہیں: "شوقِ فضول و جرأتِ رندانہ" والی بات ہے۔ یا

○

وہ صبحِ ازل کا سناٹا، یہ شامِ ابد کی تنہائی
اُس وقت بھی تنہا جاگے تھے، اس وقت بھی تنہا نیند آئی

اے ساقیٔ مہوش، آنکھیں ہی کیا کم تھیں بیخود کرنے کو
کیوں کاگ اُڑاتی صہبا اور کیوں ہوش اُڑاتی انگڑائی

یہ سُرخیٔ خونِ شہیداں ہے تم جس کو شفق ٹھہراتے ہو
اُس وقت بھی پردے ڈالے تھے اِس وقت بھی کوشش فرمائی

غنچے کے منھ سے نہ کچھ پھوٹا جب عینِ بہار میں قتل ہوئے
ہاں، رنگِ حنا احساں ہے ترا سچ بات جو تُو نے پھیلائی

اے سوزِ دروں جذبِ چمن اک تیرا سہارا باقی ہے
گلچیں نے تو دل کا خون کیا ارمانوں کی دنیا لُٹوائی

غیروں سے ہم کو شکایت کیا جب خون ہی پانی بننے لگا
جب اپنے سائے بھاگتے ہیں، جب خون کا پیاسا ہے بھائی

نکلے تھے بڑے ارمانوں سے دعوائے نیابت کر کے میاں
مت پوچھو ہم کو ملائک سے کب کب اور کتنی شرم آئی

اب یادِ لب و رخسار سے کیا جب منھ ہی اُس نے پھیر لیا
جب دل کا شیشہ چُور ہوا، اب آرسی اپنے نہ کام آئی

اب نقوی خاک اُٹھانا ہے اور جنگل جنگل پھرنا ہے
ہاں، ترکِ محبت لازم ہے، کہتے تھے نہ تجھ سے ہم بھائی

۲۲ اپریل لغایت ۲۷ اپریل ۷۵ء

○

جنگ میں صلح کی اور صلح میں لڑنے کی ادا
تیری ہر بات نئی تیرا ہر انداز نیا

تجھ سے شکوہ جو کریں آنکھوں میں آنسو بھر لائے
شکر یہ تیرا ادا ہو تو شکایت پیدا

تیری زلفوں کی تمنا ہو تو شانوں پہ کھلیں
دستِ تسلیم کا اراہ ہو تو آغوش ہو وا

بات کرتا ہے تو اس طرح کہ رس گھولے ہے
مسکراہٹ ہے کہ چلتا ہوا جادو گویا

تیرا ہر تارِ نفس، تارِ رگِ جاں سے عزیز
تیری خوشبوئے بدن راحتِ جاں، روح فزا

تیری آنکھوں کے تصور میں فرشتے بے خواب
نورِ رخسار ہے حوروں کے لیے حیرت زا

تیری آواز کی نرمی سے ترنم زندہ
تیری گفتار کی گرمی سے چمن نغمہ سرا

تیری رفتار سے امواجِ ہوا محوِ خرام
تیرے رُک جانے سے بہتا ہوا دریا ٹھہرا

تیری یادوں کے کنول دل میں چراغاں کر دیں
تیری خوشبو جو ملے، غنچۂ تصویر ہو وا

تجھ سے دُوری میں بھی ہیں قُرب کے پہلو کتنے
اور اگر قُرب میسّر ہو تو سبحان اللہ

تجھ سے باتیں جو کریں پہروں تو لمحے سمجھیں
تُو جو خاموش رہے برسوں میں گزرے لمحا

تیری زلفوں کی گھنی چھاؤں جو نقوی کو ملی
آفتابِ غمِ دوراں سے نہ کچھ کرتے بنا

۵ مئی ۷۵ء

○

نہ ہنساتا ہے ہمیں اور نہ رُلاتا ہے ہمیں
پھر بھی وہ بندۂ بے دام بناتا ہے ہمیں

جب سے اُس شوخ نے اندازِ نظر بدلا ہے
جو بھی مِلتا ہے وہ انداز دکھاتا ہے ہمیں

شوق کی بے بصری ہے کہ بصیرت کا کمال
اب تو ہر گام پہ وہ بُت نظر آتا ہے ہمیں

چھیڑیئے گر تو وہ گُل اور بھبوکا ہو جائے
غصّہ آتا ہے تو کچھ اور بھی بھاتا ہے ہمیں

یوں تو محفل میں مخاطب نہیں ہوتا لیکن
مُسکراتا ہے، جو تنہا کبھی پاتا ہے ہمیں

کیسے اُس شوخ کی بیگانہ وشی کو ڈھکیں
بن کے بیگانہ بھی کس درجہ لُبھاتا ہے ہمیں

اپنا شیوہ رہا دھارے کے مخالف چلنا
مصلحت کارِ خرد پھر بھی ڈراتا ہے ہمیں

ہم نے نقوی سا برہ گی نہیں دیکھا یارو!
جاں پہ بن آئی ہے پھر بھی وہ ہنساتا ہے ہمیں

۲۷/ مئی ۱۹۷۵ء

○

خاک اُڑائی جنگل جنگل گشت کی میلے میلے ہم نے
تیری خاطر اے دلِ وحشی کیا کیا پاپڑ بیلے ہم نے

آگ اور خون میں ڈوبی دُنیا اب کیا ہم سے چاہے ہے
جنّت چھوڑی پاپ بٹورے جھیلے کیسے جھمیلے ہم نے

خون پسینہ ایک کیا تو قصرِ اَمل تیار ہوا
پھر بھی من کامیت نہ پایا اور گزاری اکیلے ہم نے

قیس و دامن جیسے ہر دم اپنے جلَو میں رہتے ہیں
دیکھو کیسے کیسے بنائے عشق میں اب تک چیلے ہم نے

روز و شب یاروں کی طرف سے ہم پر اینٹوں کی بارش
حالانکہ دشمن کی طرف بھی پھینکے نہ ہر گز ڈھیلے ہم نے

ہم نے تو گُل پاشی کی تھی آگ یہ کیسی برسی، لوگو!
کوئی ہمیں لِلّٰہ بتاؤ، کیسے کھیل یہ کھیلے ہم نے

بانکے، ٹیڑھے، تیکھے، ترچھے، دیکھے ہوں گے میرؔ نے نقوی
تو ملتا تو وہ بھی کہتا دیکھے نہ تجھ سے اکیلے ہم نے

۱/۱۳ جون ۷۵ء

○

اُف یہ کالی گوری آنکھیں
ہائے یہ چورا چوری آنکھیں

کہنے کو خاموش ہیں، لیکن
کرتی ہیں شہ زوری آنکھیں

جسم بلائے، آنکھ بھگائے
کورا بدن اور کوری آنکھیں

اُن کا چہرہ، میری نظریں
چندا اور چکوری آنکھیں

لاکھ بچائیں دل کو، لیکن
کرتی ہیں جھک جھوری آنکھیں

طفلِ دل کو نیند سی آئے
دیتی ہیں کیا لوری آنکھیں

ابرِ الم جب دل پر چھائے
برسیں ہیں گھنگھوری آنکھیں

گاہ ہنسائیں، گاہ رُلائیں
نقوی چوری چوری آنکھیں

۱۳/۵ جون ۷۵ء

پھر ذوقِ تحسین۔ جو بھی سمجھ لیجیے۔

ع وہ یہ کہتے ہیں کہ کیا خوب کہا ہے واللہ
میں یہ کہتا ہوں کہ آداب بجا لاتا ہوں

چنانچہ رامپور کی ادبی صحبتوں کی حد تک آداب بجا لاتا رہتا ہوں، اخباروں اور رسالوں میں میری غزلیں شائع ہوتی رہتی ہیں اور بعض احباب نے انھیں پسند بھی کیا ہے۔ آل انڈیا ریڈیو لکھنؤ سے محبی شجاعت علی صاحب کے تبصرہ نے میرا دل بڑھایا ہے۔ موصوف نے نہایت محبت کے ساتھ میری کتاب "چمن جاگے" پر تبصرہ فرمایا جس کے لئے میں اُن کا ممنون ہوں۔

استادِ محترم جناب عرشی مدظلہ، اور عزیزی پروفیسر محمود الٰہی صدر شعبۂ اردو گورکھپور یونیورسٹی کا شکریہ "چمن جاگے" میں ادا کر چکا ہوں — یہ دونوں حضرات اب بھی میری غزلوں میں دلچسپی لیتے ہیں اور استاد محترم تو باوجود بے انتہا مصروفیت اور بے حد نقاہت کے میرے کلام پر اصلاح فرماتے رہتے ہیں جس کے لیے میں موصوف کا ہمیشہ شکر گزار رہوں گا۔ چنانچہ "شاخِ تازہ" کی غزلیں بھی انھیں کی دیکھی اور بنائی ہوئی ہیں۔

پہلے مجموعہ کی ایک جلد میں نے پروفیسر رشید احمد صدیقی مرحوم کی حیات میں اُن کی خدمت میں پیش کی تھی۔ مرحوم نے ایک پوسٹ کارڈ لکھ کر میری رہبری فرمائی۔ ضروری سمجھتا ہوں کہ اُس کی نقل یہاں

○

میں دل بیچتا ہوں، جگر بیچتا ہوں
نہیں کوئی گاہک، مگر بیچتا ہوں

فقط اک نگاہِ نوازش کے بدلے
خریدو تو اپنا جگر بیچتا ہوں

لگاتا ہوں آوازِ شہرِ بُتاں میں
میں اپنا دلِ بے خبر بیچتا ہوں

مرے دل کی بپتا فسانہ نہیں ہے
کہانی بڑی معتبر بیچتا ہوں

کسی سے گرامیدِ دل بستگی ہو
تو کلیوں کا خونِ جگر بیچتا ہوں

مرے دل کے تم نے اُڑائے جو پُرزے
وہی اب سرِ رہ گزر بیچتا ہوں

خفا ہو کہ کل دل کا سودا نہ ٹھہرا
مگر اب کرد در گزر بیچتا ہوں

جو مخمل کے تکیوں پہ ہیں محوِ راحت
ہیں اُن کے لیے دردِ سر بیچتا ہوں

مرے خط میں اُس کا بھی مضموں ہے نقوی
خریدے اگر نامہ بر بیچتا ہوں

۹/۱۱ جولائی ۷۵ء

○

چھوڑ کر شہر کو اب سوئے بیاباں نکلو
سارباں نیند میں ہے خود ہی حُدی خواں نکلو

پھر گھٹا گھر کے پیے بادہ گساراں آئی
جشنِ آبی کے لیے اہلِ بہاراں نکلو

مُدتوں ہم نے گوارا کیا تم کو لیکن
شوق کی راہ سے اے خارِ مغیلاں نکلو

دستِ فصّاد لہو لینے میں تھکنے کا نہیں
خونِ فاسد کی طرح رگ سے گریزاں نکلو

دوستو! آئینۂ وہم و گماں کو توڑو
کیوں زیاں خانے میں ہو شدر و حیراں نکلو

کیوں خزف ریزوں کو اکلیلِ سلیماں بخشو
قعرِ گم نامی سے اے لعلِ بدخشاں نکلو

پیشہ در مدح سراؤں کا کرو قافیہ تنگ
مرہمِ زخم کی جا، لے کے نمکداں نکلو

شاہراہوں کو منور کرو قندیلوں سے
شمعِ مہتاب کے مانند فروزاں نکلو

محفلِ دوست کی تاریک فضاؤں کو مٹاؤ
اُفقِ شرق سے جوں نیّرِ تاباں نکلو

طاقِ کسریٰ سے بنے شیش محل توڑ بھی دو
عزم بالجزم کرو خشتِ بداماں نکلو

نگہِ ناز کو پابندِ سلاسل کر دو
جبینِ پیشانیٔ خوباں سے پریشاں نکلو

دیکھو تاریخ کے اوراق نہ الٹیں پیچھے
دم بدم آگے بڑھو فتح بہ داماں نکلو

زندگی اور حسیں اور حسیں اور حسیں
پیئے تزئینِ جہاں فخرِ حسیناں نکلو

مدتوں بعد ہیں ہم شہر نگاراں آئے
دیکھو، اب رم نہ کرو ہم سے غزالاں نکلو

پھر فروزاں کرو چہروں کو مئے گلگوں سے
ہاتھ میں ہاتھ دیئے آؤ نگاراں نکلو

آج پھر سروِ چمن کو ہے غرورِ قامت
اُسے شرمندہ کرو، سروِ خراماں نکلو

پھر جگر تابی و دل سوزی کا پیغام آیا
نقوی نغمہ سرا، تم بھی غزل خواں نکلو

۱۱ جولائی ۷۵ء لغایت ۱۷ جولائی ۷۵ء

نوٹ۔ مقطع سے پہلے کے تین شعر ۲۲ جولائی ۷۵ء کو پنجاب میل سے لکھنؤ جاتے ہوئے کہے گئے۔

○

پہلے نگاہ ناز تو پیدا کرے کوئی
پھر میرے دل کو شوق سے لوٹا کرے کوئی

کیوں زندگی میں زیست کا شکوہ کرے کوئی
مر جائے شوق سے جو تمنّا کرے کوئی

دیدار جو سے قصد اگر ہے حجاب کا
کیوں طور پر بلا ہمیں رسوا کرے کوئی

کیوں جائیں یوں کسی کے یہاں دید کے لیے
بھیجے پیام جو ارادہ کرے کوئی

نفرت نہیں جو ہم سے تو کیوں غیر سے ہے پیار
کیوں کاروبارِ شوق کو رسوا کرے کوئی

مرتے ہیں لوگ اک نگہِ ناز کے لیے
اُن کی گلی میں جا کے نظارا کرے کوئی

ہر لحظہ چشمِ شوق کو ہے دعوتِ نگاہ
اس شرط پر کہ دیدۂ دل وا کرے کوئی

ہم بھی تو دیکھیں کون مسیحائے شہر ہے
دُکھتے ہوئے دلوں کا مداوا کرے کوئی

جاتا ہوں بزمِ دوست کی جانب واں دوا
نقوی نہ ہو جو تاب تو پھر کیا کرے کوئی

۱۸ لغایت ۱۹ جولائی ۷۵ء

○

دیوانوں کی باتوں پر ہنستے ہیں جہاں والے
وہ دیر و حرم والے، ہم کوئے بتاں والے

اس باہمی رشتے کو سب خوب سمجھتے ہیں
ہم زخمِ جگر والے، تم تیر و سناں والے

اب آ کے اِدھر بیٹھو، کچھ کام کی باتیں ہوں
کہتے ہوں جہاں والے، بکتے ہوں جہاں والے

اونچا ہے دلِ شیدا کیف و کمِ دوراں سے
کیا دام لگائیں گے یہ سود و زیاں والے

آئینِ تمنا ہے، سر اُس کے لیے دینا
اوطشتِ طلا والے، اونوکِ سناں والے

دُزدِ دیدہ نظر کو ہم مُدت سے ترستے ہیں
اک تیر لگاتا جا، اَبرو کی کماں والے

ہنگامۂ ہستی ہے موقوف اِنھیں دو پر
کچھ چاند سے رُخ والے کچھ آہ و فغاں والے

اک چاند سے چہرے پر بکھری ہیں یہ زلفیں
کس طرح جئیں یارب اب تیرے جہاں والے

نقوی، تری دنیا میں کس طرح بسر ہوگی
تو عزم و یقیں والا، سب وہم و گماں والے

۱۹ر جولائی ۵۷ء کو تمام ہوئی

○

ہمیں ہے اُن سے محبّت کسی کو کیا معلوم
اُنھیں ہے ہم سے عداوت کسی کو کیا معلوم

کب آئیں بہرِ عیادت کسی کو کیا معلوم
نظر ملے دمِ رُخصت کسی کو کیا معلوم

ابھی تو فتنۂ قامت ہے محوِ آرائش
کب آئے چل کے قیامت کسی کو کیا معلوم

کبھی ہیں انجمنِ ناز میں کبھی دل میں
ہمیں ہے جلوت و خلوت کسی کو کیا معلوم

ہنوز عشق میں بے تابیوں کا عالم ہے
سکون بخشے کب آفت کسی کو کیا معلوم

سیادت و شرفِ عشق کی ہے بات ہی اور
کسے ملے یہ سعادت کسی کو کیا معلوم

شائع ہو جائے ۔ اس لیے نہیں کہ اس خط میں رشید صاحب نے میری کتاب پر اپنی رائے کا اظہار کیا ہے بلکہ اس لیے کہ ان کی تحریر اُردو والوں کے لیے تبرک کی حیثیت رکھتی ہے۔ رشید صاحب پر کام کرنے والوں کی نظروں سے اس خط کو پوشیدہ رکھنا ایک فرض سے کوتاہی کرنا ہے۔

عزیزی و مکرمی پروفیسر سید سبیہہ الحسن صاحب صدر شعبۂ اردو لکھنؤ یونیورسٹی کا بے حد ممنون ہوں کہ موصوف نے "باغِ تازہ" کے لیے نہایت عمدہ پیش لفظ تحریر فرمایا۔ مگر میں خود کو ان صفات کا حامل نہیں پاتا جن کا ذکر سبیہہ الحسن صاحب نے پیش لفظ میں کیا ہے ۔ البتہ میں ان کی اس تحریر کو ایک معیار ضرور سمجھتا ہوں جو میری رہبری کرتا رہے گا۔
کاش میری شاعری میں وہ خوبیاں پیدا ہو سکیں جن کا پروفیسر موصوف نے پیش لفظ میں تذکرہ کیا ہے۔

۱۵ اگست ۱۹۷۷ء

سید نجم الدین نقوی
شعبۂ اردو
گورنمنٹ رضا پوسٹ گریجویٹ کالج
رامپور۔ یو۔ پی

غموں کی آگ میں تپ کر ہی چین ملتا ہے
ہمیں نصیب ہو راحت کسی کو کیا معلوم

اُنھیں جو ہاتھ لگاؤ تو رنگ ہو میلا
کہاں یہ گُل میں لطافت کسی کو کیا معلوم

ہمیں نے اُلجھے ہوئے گیسوؤں کو سُلجھایا
ہمارے ہاتھوں کی قسمت کسی کو کیا معلوم

کسی کے نام کی خاطر ہمیں شہید ہوئے
بہ جُرمِ عشق و محبت کسی کو کیا معلوم

شریف گردی کے اس دور میں میاں نقوی
بچی رہے گی شرافت کسی کو کیا معلوم

۱۵ اگست ۷۵ء

○

مُدّعا کریں گے، نہ شکوہ کریں گے
یوں ہی زخم پر زخم کھایا کریں گے

تمنّا کریں گے، تقاضا کریں گے
کہاں تک نہ پھر آپ جلوہ کریں گے

نہ جلوہ کریں گے نہ پردا کریں گے
یونہی آپ ہم کو تپایا کریں گے

حجاباتِ عالم اُٹھانا پڑیں گے
اگر آپ یوں ہم سے پردہ کریں گے

سمجھتے ہیں، آئینہ رُسوا کرے گا
مگر پھر بھی آئینہ دیکھا کریں گے

ازل سے ابد تک ہے اک ہُو کا عالم
وہی وہ ہیں، کس کا تماشا کریں گے

کہا میں نے دل لے کے دل دو تو بولے
محبّت میں کیا آپ سودا کریں گے

محبت میں مانا ہیں رسوائیاں بھی
مگر یہ نہ ہو گی تو پھر کیا کریں گے

ابھی تو فقط گھر کو پُھونکا ہے نقوی
خدا جانے اب آپ کیا کیا کریں گے

۶ اگست ۷۵ء

○

پھر دل کو ہے جہاں میں خریدار کی تلاش
اک شوخ و تنگ مایۂ آزار کی تلاش

کم بخت چاہتا ہے کہ در پہ پڑا رہے
سب ترک کر کے اندک و بسیار کی تلاش

بیمار خود ہے اس لیے بیمار سے ہے عشق
کرتا ہے روز نرگسِ بیمار کی تلاش

اک چپ سی لگ گئی ہے تو کہتے ہیں طنز سے
کیا تم کو اب نہیں لبِ اظہار کی تلاش

اب بے دماغیوں سے ہوا عشق میں یہ حال
انکار پر ہے رنج نہ اقرار کی تلاش

منصور و طور و موسیٰ عمراں سے لو سبق
قدرت کرے ہے ظرفِ قدح خوار کی تلاش

گو ہم نے دل کے کھیل میں پہلے بھی کھائی مات
پھر بھی ہمیں ہے شاطرِ دلدار کی تلاش

معیارِ جورِ غم کو بڑھانا ہے دوستو!
کرتا ہوں روز اک نئے آزار کی تلاش

زلفوں کا دام، آنکھوں کا جادو، لبوں کا شہد
رکھتا ہو جو، ہے ایسے خریدار کی تلاش

قدرت کو اپنی بخششِ کامل پہ ناز ہے
پھر کیوں نہ ہووے ہم سے گنہ گار کی تلاش

دل ہی نہیں وہ قابو میں رکھے جسے کوئی
نقوی عبث ہے ایسے گرفتار کی تلاش

۷/۸ اگست ۶۷۵

○

کیوں تم کو مجھ سے اتنی عداوت ہے دوستو
میرا قصور صرف محبت ہے دوستو

بخشو مجھے، معاف کرو، درگزر کرو
مت آؤ میرے پاس جو نفرت ہے دوستو

ہٹ جاؤ میری راہ سے ڈھونڈو نئی سبیل
میرے چلن سے تم کو جو نفرت ہے دوستو

دھو ڈالو اپنے سینوں سے گردِ ملال کو
حاضر زلالِ صدق و شرافت ہے دوستو

آئینہ رُخ ہو آئنۂ دل بھی صاف ہو
نقصِ جمال گردِ کدورت ہے دوستو

اُلفت کی ٹھنڈی چھاؤں میں بیٹھو تو اک ذرا
بُغض و عناد، دھوپ کی حدّت ہے دوستو

لب وا کرو تو دل کے دریچے بھی کھول دو
ورنہ تو خامُشی ہی غنیمت ہے دوستو

تم جیسا حق شناس تو پایا نہ جائے گا
محسن کُشی ہی حقِّ عنایت ہے دوستو

اپنے پہ کر رہا ہے قیاس اہلِ دہر سا
نقوی ۔ مگر یہ عینِ حماقت ہے دوستو

۹ اگست ۷۵ء

○

کیوں نہ پھر شہرِ خموشاں میں صدا دی جائے
شمعِ محفل جو سرِ شام بجھا دی جائے

جب ملے آنکھ کسی سے تو جلا دی جائے
"ہے جو یہ رسم تو یہ رسم اُٹھا دی جائے"

تلخیوں سے تو کبھی ہوش نہیں آنے کا
ہو سکے تو کسی دامن کی ہوا دی جائے

حیرتِ چشمِ گلہ مند تو کچھ کر نہ سکی
جوئے خوں آنکھوں سے پھر کیوں نہ بہا دی جائے

روشنی کے لیے کیوں طُور کے محتاج بنیں
داغِ دل ہی سے نہ کیوں شمع جلا دی جائے

آئینے گردِ کدورت سے جو بد باطن ہوں
کیوں نہ اخلاص کے چھینٹوں سے جِلا دی جائے

عقلِ عیّار کا پرہیز مُداوا ہے مرض
دل بڑے کام کی شے ہے جو دوا دی جائے

وہ تو کہیے کہ نہیں معرفتِ عکسِ جمال
آئنہ چُور ہو، گر بات بتا دی جائے

طُور تک آنے کی زحمت نہ گوارا ہوا گر
اک جھلک پردۂ دل ہی سے دِکھا دی جائے

والہانہ نگہِ شوق جو اُٹھ جائے کبھی
بے گناہی کی خطا پر نہ سزا دی جائے

ہم نے مانا کہ تخاطب میں ہے رُسوائی مگر
ہرج کیا ہے جو نگاہوں سے صدا دی جائے

ہاں، گنہ گار ہیں اعلانِ حقیقت کر کے
ہے مناسب جو سرِ دار سزا دی جائے

جیتے جی اُس کی گلی سے جو نہ اُٹھا نقوی
ہے مناسب کہ وہیں قبر بنا دی جائے

۱۱ اگست ۷۵ء

○

دُھوپ پھر کیسے گوارا ہوگی
مہر کی چھاؤں جو عنقا ہوگی

پانی ہو جائیں گے سب شیش محل
موم اب ہر رگِ خارا ہوگی

اب تو ہر غنچہ دہن بولے گا
اب تو تصویر بھی گویا ہوگی

قُفلِ سوسن کی زباں پر ہوں گے
مثلِ تصویرِ سراپا ہوگی

داغِ محنت کے فروزاں ہوں گے
ہر ہتھیلی یدِ بیضا ہوگی

آنکھیں بوجھل نہ رہیں گی اُس بن
چارہ گر، نرگسِ شہلا ہوگی

نقل تحریر پروفیسر رشید احمد صدیقی مرحوم

۲۲ جنوری ۷۷ء ۔ ذاکر باغ ۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی ۔ علی گڑھ

محترمی بتسلیم ۔ گرامی نامہ اور مجموعہ کلام "چمن جاگے" موصول ہوئے۔ یاد فرمائی و عزت افزائی کا شکر گزار ہوں۔ ایک عرصہ سے صحت اچھی نہیں رہتی ۔ پڑھنے لکھنے سے پرہیز بتایا گیا ہے باہمہ اوراق گردانی کر گیا۔ آپ کے کلام کے بارے میں محترمی عرشی صاحب اور پروفیسر ڈاکٹر محمود الٰہی صاحب نے جن توصیفی کلمات کا اظہار فرمایا ہے اُس کی تصدیق کرتا ہوں۔ آپ نے جو کچھ گزارش احوال واقعی کے تحت تحریر فرمایا ہے وہ ایک شاعر اور معلم کے شایانِ شان ہے جس کی مبارک باد دیتا ہوں۔

شاعری بالخصوص اردو غزل میں زبان اور لب و لہجہ کی بڑی اہمیت ہے۔ صفحہ ۸۰ پر یار والی غزل میں یار کا لفظ کھٹکتا ہے۔ وہ بھی ردیف کے طور پر مسلسل۔ ثقافت کی زبان پر یہ لفظ کم آتا ہے۔ کچھ دن ہوئے نئے انداز کی شاعری میں یہ لفظ بڑا مقبول

زہر ہونٹوں سے نہ اب ٹپکے گا
طعن و تشنیع شکر زا ہوگی

اب نہ شمشاد کو سولی ہوگی
اب تو قدرِ قدِ بالا ہوگی

تیرہ باطن نہ کبھی چمکیں گے
دل کی تنویر ہویدا ہوگی

وسوسوں سے نہ تکدّر ہوگا
اب فضا دل کی مصفّا ہوگی

اُس نے لو دوش پہ ڈالیں زُلفیں
اب فضا عنبرِ سارا ہوگی

اُن سے نظریں جو ملیں گی نقوی
دل کی دُنیا تہہ و بالا ہوگی

۱۷/۱۸ اگست ۷۵ء

○

دل ہے اسیرِ گیسوئے جاناں میں دوستو
الجھا ہوا ہوں کاکلِ پیچاں میں دوستو

لوہو سے داغ داغ ہے پیراہنِ قمر
خونِ شفق کا رنگ ہے داماں میں دوستو

کیا کم تھیں دل کے واسطے ریشہ دوانیاں
نشتر دیا جو تم نے رگِ جاں میں دوستو

دل ہی نہیں کہ سیر کی خاطر لیے پھرے
اب کیا دھرا ہے شہر و بیاباں میں دوستو

شیشے سے انگبیں کی طرح جھانکتی ہوئی
بلقیس آئی بزمِ سلیماں میں دوستو

لہرا کے اُس نے زلف، چمن میں بڑھائے ہاتھ
زنجیر و طوق پہنو بہاراں ہیں دوستو

سُنتے ہیں کوہِ طور کی جانب ہے روشنی
جھانک تو اک ذرا دلِ سوزاں میں دوستو

عسرت ہو گر تو "حضرتِ ابلیس" بھی شریف
پرکھ بشر کو دولتِ ارزاں میں دوستو

تم کو نہیں ملے گا وہ دار السرور میں
تقویٰ کو دیکھ کوئے نگاراں میں دوستو

۲۴/۲۵ اگست ۷۵ء

○

تری مرضی تھی جو ہم نے دعا کی
وگرنہ ہم کو کب فرصت صدا کی

ترحّم بارِ خاطر ہو نہ جائے
طبیعت خوگرِ غم ہے بلا کی

ترے نقشِ قدم پر گل کو وارے
یہی بس ایک حسرت ہے صبا کی

موذن اک ذرا تاخیر للّٰلہ
اُچٹ جائے نہ نیند اس مہ لقا کی

مرے پہلو سے وہ کہہ کر یہ اُٹھے
ملیں گے پھر جو قسمت نے وفا کی

نگاہِ بے محابا تیرے صدقے
بنایا بزم میں کس کس کو شا کی

دل بے صبر کب تک نالے کرتا
ہوا خاموش بالآخر وہ باکی

صبا، تیری روش الجھائے گی اور
"بگڑنے میں جو زلف اس کی بنا کی" ؎۱

میاں نقوی اسی سے دل لگاؤ
رہے ہو عمر بھر تم جس کے شاکی

۲۷؍ اگست ۷۵ء

؎۱ یہ مصرع مومن کا ہے اور پورا شعر یوں ہے ۔

چلی شوخی نہ کچھ باد صبا کی
بگڑنے میں بھی زلف اس کی بنا کی

○

زلف کا اُس کی جو سودا جائے گا
آبِ حیواں کیسے پایا جائے گا

آپ بالیں سے بس اب اُٹھ جائیے
آپ سے ہرگز نہ دیکھا جائے گا

آگ سے ہم کھیل سکتے ہیں مگر
مہ رُخوں کو کیسے برتا جائے گا

رات دن کی کوفت سے گھُٹتا ہے دم
جان ہی سے اب تو گزرا جائے گا

دامِ گیسو سے بھلا چھُٹیں گے کیا
سایۂ زلفِ چلیپا جائے گا؟

وہ کفِ افسوس ملنے کے نہیں
رائگاں خونِ تمنّا جائے گا

سر پھرو! کوہ و بیاباں چھان لو
اِس سے کیا سر کا یہ سودا جائے گا

دل لگائیں آؤ اُس سفّاک سے
جو بھی ہو گا اُس کو دیکھا جائے گا

نقویؔ آشفتہ حال و خستہ دل
تجھ پہ کیا اب رحم کھایا جائے گا

۵/۶ ستمبر ۷۵ء

○

ہم نہ کہتے تھے تم سے کہ اے جانِ جاں
رنگ لائیں گی اک دن یہ دلداریاں

اب بہاتے ہو آنسو کہ رسوا ہوئے
پہلے سوچا نہ کیوں ہوں گی رسوائیاں

عشق آساں بھی ہے اور دشوار بھی
عشق کے روبرو کیسی دشواریاں

سارے عالم میں ہے عشق چھایا ہوا
عشق سے بچ کے نکلیں تو جائیں کہاں

عشق ہی نے عطا کی ہیں سب برکتیں
عشق ہی ہم میں تم میں ہے جلوہ کناں

حاصلِ عشق بس عشق ہی عشق ہے
عشق میں ہے عبث فکرِ سود و زیاں

عشق اوّل بھی ہے عشق آخر بھی ہے
اور کوئی نہیں فاصلہ درمیاں

عشق مارے بھی ہے اور جلائے بھی ہے
عشق خاکستر اور عشق چنگاریاں

عشق سے ولولے عشق سے زلزلے
عشق ہے آب جیواں و آتش فشاں

عشق واجب بھی ہے اور امکان بھی
اور امکان و واجب کے بھی درمیاں

عشق بندہ بھی ہے اور خداوند بھی
عشق مومن بھی اور رہبرِ مومناں

عشق عاشق بھی ہے اور معشوق بھی
عشق کے دم سے صد رنگ گُل کاریاں

عشق حاکم بھی ہے اور محکوم بھی
اور طرفہ ستم ہے حکم درمیاں

عشق پیتا بھی ہے اور پلاتا بھی ہے
عشق رندِ بلانوش و پیرِ مغاں

کوئی معشوق ہے اور نہ عاشق کوئی
عشق ہی ہر طرف ہے جدھر دیکھو میاں

عشق کے مرتبے اُس نے واضح کیے
اب بھی نقوی سے ملنے میں رسوائیاں

۱۰ ستمبر ۷۵ء

رہا۔ لیکن ان کے یہاں آہنگ اور آداب کو زیادہ اہمیت نہیں دیتے۔ ایسے الفاظ کا استعمال کرنا عیب نہ سہی مگر کمال بھی نہیں اسی طرح نمک نالی غزل کے بارے میں بھی کہنا ہے کہ چونکہ اس ردیف میں غالب نے غزل کہی ہے اس لیے آپ بھی کہیں یہ کچھ ضروری نہیں ـــــ غالب کا بھی یہ کوئی کارنامہ نہیں ہے میری گزارش ہے کہ نہ کسی کے پیچھے پڑیئے نہ کسی کے پیچھے چلیے۔ امید ہے مزاج عالی مع الخیر ہوگا۔

مخلص

رشید احمد صدیقی

سید نجم الدین نقوی صاحب
گورنمنٹ رضا کالج
۱۲۔اے۔فورٹ
رامپور۔یوپی
۱۲۔اے۔قلعہ۔رام پور
اتر پردیش

○

دلِ وحشی سے پیار کون کرے
جبر کو اختیار کون کرے

رائگاں ساری محنتیں ہوں گی
جمع دامن کے تار کون کرے

اشکِ خونیں ہیں گُل کھلانے کو
انتظارِ بہار کون کرے

ہم نہ ہوں گر شریکِ محفلِ ناز
اُن کو پھر شرمسار کون کرے

ہم کو خود انتظار ہے اپنا
آپ کا انتظار کون کرے

دل پہ اپنے نہیں ہے جب قابو
اُن سے قول و قرار کون کرے

ہم تو لالہ رُخوں سے باز آئے
سینے کو داغ دار کون کرے

ہم ہی شکوہ دل سے باز آئیں ندیم
اُن کو پھر اشک بار کون کرے

داغِ دل مت گنوا اے نقوی!
سیرِ زخمِ بہار کون کرے

۱۷/۱۸ ستمبر ۷۵ء

بے خبر دنیا سے رہ کر معتبر ہو جائیے
حلقۂ اہلِ نظر میں دیدہ ور ہو جائیے

شوقِ دل بن جائیے ذوقِ نظر ہو جائیے
آپ جو چاہیں بنیں، اپنے مگر ہو جائیے

دل کے بہلانے کو آوارہ نظر ہو جائیے
عقل کی ہر گز نہ سُنیے، دیدہ ور ہو جائیے

ہائے وہ آنکھیں کہ بربادی و رسوائی کریں
جی میں آتا ہے کہ نخچیرِ نظر ہو جائیے

جا رہے ہیں ہم تو سوئے گلستاں جانِ بہار
کیا بُرا ہے آپ بھی گر ہم سفر ہو جائیے

چارہ گر کی فکر میں کیوں چھانیے دنیا کی خاک
خود نگر بن کر خود اپنے چارہ گر ہو جائیے

اعتبارِ اہلِ عالم تو بڑی شے ہے، مگر
"کم سے کم اپنی نظر میں معتبر ہو جائیے"

آئیے بیتِ حزن میں چند لمحوں کے لیے
چاند بیٹھیے، رونقِ دیوار و در ہو جائیے

کاروانِ شوق گزرے گا اِدھر سے ایک دن
جی میں آتا ہے کہ خاکِ رہگزر ہو جائیے

امتثالِ امرِ عشق و نازِ معشوقاں بجا
شوق پھر بھی چاہتا ہے خود نگر ہو جائیے

"دیدہ و دل فرشِ راہ" و جاں نثارِ رہگذر
اے خوشا قسمت کہ پھر گردِ سفر ہو جائیے

نقویؔ آشفتہ حال و خستہ و رنجورِ ہجر
اب بھی بچ سکتا ہے آپ اُس کے اگر ہو جائیے

۱۹/۲۱ ستمبر ۷۵ء

○

کب ہم اسیرِ کاکلِ پیچاں نہیں رہے
سُنبل مثالِ نیک پریشاں نہیں رہے

اب کاروبارِ شوق سے کیا واسطہ کہ جب
چہرے فروغِ مے سے گلستاں نہیں رہے

اب صبح و شام وہ بُتِ کافر ہے مہرباں
اب ہم حریفِ گردشِ دوراں نہیں رہے

اب کیا چمن کو جائیں کہ سنسان ہے فضا
رشکِ ہزار دستۂ خراماں نہیں رہے

اب نظم و ضبطِ عالمِ امکاں کی خیر ہو
چہرے پہ اُس کے بال پریشاں نہیں رہے

سُرمے سے تیز دشنۂ مژگاں کی آرزو
کیا اب حریفِ خنجرِ بُرّاں نہیں رہے

اللہ رے حسنِ شوخ کی کافرادائیاں
کہتے ہیں شیخ جی بھی مسلماں نہیں رہے

دل لگ گیا ہے خانۂ زنجیر میں بہت
شاید بقدرِ شوقِ بیاباں نہیں رہے

کیوں تیرگی سی چھائی ہے دنیائے خلق میں
ہندو نہیں رہے کہ مسلماں نہیں رہے

ہر دم غزل سرائی و دیوانگیٔ عشق
لطفیؔ تم اب تو کام کے انساں نہیں رہے

۲۲/۲۵ ستمبر ۷۵ء

○

یہ جو اپنا حال رہے گا
جینا اک جنجال رہے گا

حُسن مُصیبت، عِشق قیامت
جینے کا اب کال رہے گا

دل کی بستی لُوٹنے والو!
کیسے کوئی خوش حال رہے گا

مستقبل کی فکر کرو کچھ
کب تک ماضی حال رہے گا

آتشِ شوق نہیں بجھنے کی
خون اگر سیّال رہے گا

روحِ چمن پر کیا گزرے گی
سبزہ جب پامال رہے گا

نقدِ جاں لٹتا ہی رہے گا
حُسن تو مالا مال رہے گا

ہم پہ قید نہیں لگنے کی
یوں ہی عرضِ حال رہے گا

عشق کی قسمت رنج و مصیبت
عشق کو اضمحلال رہے گا

جانتے تھے پھر بھی نہ خبر لی
نقوی کو یہ ملال رہے گا

۲۳/۲۵ ستمبر ۷۵ء

جگہ جگہ جو تری گردِ رہگذر میں تھا
ہر ایک ذرّۂ دل منزلِ قمر میں تھا

بہت دنوں سے دکھائی کہیں نہیں دیتا
وہ ایک شخص جو دیوانہ سا نگر میں تھا

اگر حجاب ہی کرنا تھا تو الگ رہتے
یہ کیا کہ جلوہ سا ہر سمت ہر ڈگر میں تھا

ہمیں نے پیرکے دریائے خوں شرف بخشا
زمانہ ورنہ ازل سے ہچر مچر میں تھا

پلٹ کے دیکھیں وہ شوق ہیں کہ کیا گزری
ہمارے ساتھ کوئی اور بھی سفر میں تھا

بچا بچا کے نظر ہم سے دیکھنا تیرا
بتا رہا ہے کوئی اور بھی نظر میں تھا

عدو کو قتل کیا ہنس کے پھر مجھے دیکھا
یہ فتنہ اور بھی اُس شوخ کے ہُنر میں تھا

میں اپنا دامنِ دل کس طرح رفو کرتا
وہ ایک فن جو کسی چشمِ رخنہ گر میں تھا

جو گزرا غیر گلی سے تری تو کچھ نہ ہوا
مگر ہمارا گزرنا نظر نظر میں تھا

سُنا ہے چاک جگر کی طرح ہوا وہ خط
جو خونِ دل سے لکھا دستِ نامہ بر میں تھا

ہمارے بعد جو ڈھونڈیں گے دوست اے نقوی
کہیں گے لوگ کہیں نقشِ رہگزر میں تھا

۲۶ ستمبر ۷۵ء

ممنون ہوں

* اُستادِ محترم مولانا عرشی کا جن کی توجہِ مُفرط کے بغیر "باغِ تازہ" نمو پذیر نہ ہوتا۔
* پروفیسر سید شبیہ الحسن صاحب صدر شعبۂ اُردو لکھنؤ یونیورسٹی کا جنھوں نے کتاب کا پیش لفظ تحریر فرمایا
* عزیزی اظہر عنایتی سلمہٗ کا جنھوں نے کاپیاں دیکھیں اور صحت کی زحمت گوارا کی۔
* عزیزی ناظم علی خاں ایم، اے ایڈیٹر ناظم، رامپور کا جنھوں نے طباعت میں دلچسپی لی۔
* جناب شہزادے خاں "جادو رقم" کا جن کی توجہ کے بغیر کسی کا شکریہ نہ ادا ہو سکتا۔

نقوی

○

جو خال و خد کے نشانے تلاش کرتے ہیں
دِل و نظر کے ٹھکانے تلاش کرتے ہیں

اُسی سے اُس کی گلی میں جو پوچھتے ہیں پتے
سُخن وری کے بہانے تلاش کرتے ہیں

سُنا ہے جب سے کہ عاشق ہوا ہے دیوانہ
گلی گلی میں دِوانے تلاش کرتے ہیں

ہمیں جو اپنوں نے چھوڑا تو کیا ہوا اے دل
خدا رکھے کہ بگانے تلاش کرتے ہیں

بنا کے ہم کو فسانہ کدھر چھپا ہے تُو
فسانہ ساز، فسانے تلاش کرتے ہیں

ازل سے جھکتی چلی آئی ہے جبینِ نیاز
چلے بھی آؤ زمانے تلاش کرتے ہیں

رُکا ہے دم جو کبھی اپنی نارسائی سے
خفا ہوئے کہ بہانے تلاش کرتے ہیں

تلاشِ صید میں تکلیف اتنی کیا لازم
تمہیں تو خود ہی نشانے تلاش کرتے ہیں

ہُوا ہے جب سے کہ نقویؔ نغمہ سنج خموش
نفس نفس میں ترانے تلاش کرتے ہیں

۲۸ ستمبر ۷۵ء

○

بیرنگیٔ عالم کی فضا دیکھ رہا ہے
دل چاہے تھا کیا اور یہ کیا دیکھ رہا ہے

آیا تھا بڑے شوق سے فردوس بنانے
جاتے ہوئے ویران سرا دیکھ رہا ہے

اپنی جو یہ حالت ہے ہمیشہ نہ رہے گی
تم دیکھو نہ دیکھو پہ خدا دیکھ رہا ہے

ہر صبح و مسا نظریں ہیں بس ایک ہی در پر
دیوانہ خدا جانے کہ کیا دیکھ رہا ہے

خاموش نہ ہو جائے کہیں تھک کے بہ صد غم
اے قافلۂ شوق، درا دیکھ رہا ہے

دیوانہ سلامت ہے تو دامن نہ رہے گا
انداز ترے موجِ ہوا دیکھ رہا ہے

پیتا ہی رہے گا تری آنکھوں سے ہمیشہ
جو میکدۂ صبح و مسا دیکھ رہا ہے

یہ ابر بھی دیوانہ نہ ہو جائے مری طرح
بکھری ہوئی زلفوں کی گھٹا دیکھ رہا ہے

کر گزرے گا کل کیا ترا دیوانہ یہ نقوی
اب تک تو زمانے کی ہوا دیکھ رہا ہے

۳۰ ستمبر ۷۵ء

○

بکھری ہوئی زلفوں کا سماں دیکھ رہا ہے
دِل سلسلۂ ابرِ رواں دیکھ رہا ہے

جو رنگِ جہانِ گزراں دیکھ رہا ہے
مت پوچھ کہ کیا اور کہاں دیکھ رہا ہے

اے چارہ گرو تم تو ہو تدبیرِ جنوں میں
"دیوانہ خدا جانے کہاں دیکھ رہا ہے"

اِس طور سے بھٹکا ہے کہ منزل نہیں ملتی
عالم ترے قدموں کے نشاں دیکھ رہا ہے

پابستۂ زنجیرِ جنوں ہو کے رہے گا
جو زلفِ گرہ گیرِ بتاں دیکھ رہا ہے

اک جنبشِ لب کے لیے دیوانہ ہے زندہ
اب بھی تری جانب مری جاں دیکھ رہا ہے

دامانِ جنوں عقل کے ہاتھوں سے نہ چھوٹے
ہاں حلقۂ صاحب نظراں دیکھ رہا ہے

وارفتۂ غم، منہ سے کچھ ارشاد تو فرما
اب خود ترمی جانب نگراں دیکھ رہا ہے

ہم کو تو ہر اک سمت بہاریں نظر آئیں
نقاشِ چمن ہے کہ خزاں دیکھ رہا ہے

کیا جانیے کب کس گھڑی اور کس سے لڑے آنکھ
دیوانہ سرِ کوئے بتاں دیکھ رہا ہے

کیوں رشک سے غنچے کا جگر خون نہ ہو جائے
مہندی کفِ نازک میں نہاں دیکھ رہا ہے

اک شور ہے وہ آتے ہیں، وہ آتے ہیں نقوی
آمد ہے وہ آمد کہ جہاں دیکھ رہا ہے

○

اے کاش ملے کوئی سزاوارِ تمنّا
تک ہم بھی کھلائیں کبھی گلزارِ تمنّا

مُہلک نظر آیا ہے آزارِ تمنّا
بچتے ہی نہ دیکھا کبھی بیمارِ تمنّا

اوروں نے چمن زخموں کے کیا کیا نہ کھلائے
ہم ہیں کہ لیے پھرتے ہیں بس خارِ تمنّا

وہ بُلبلِ خاموش بھی محصور رہا ہے
جس نے کبھی کھولی نہ تھی منقارِ تمنّا

کیوں دل میں تمنّاؤں کے مدفن کرو آباد
کہلاتے پھرو خلق میں کیوں خوارِ تمنّا

کیا اب بھی مسیحائی کا بیٹھے گے ڈھنڈورا
اے چارہ گرو، مر گیا ناچارِ تمنّا

یہ کون و مکاں دُردِ تہہ جام ہوں لیکن
ملتا ہے کسے ظرفِ قدح خوارِ تمنّا

دل میں ہے بپا روز تمناؤں کا ماتم
یہ شہر نہ بن جائے عزادارِ تمنّا

اب ترکِ تمنّا ہی سے کچھ کام چلے گا
آئے جو بنے قافلہ سالارِ تمنّا

جب کوئی خریدار ہی ملتا نہیں نقوی
پھر کیسے لگاتے رہیں بازارِ تمنّا،

۲ر اکتوبر ۷۵ء

○

ہم پہ ہے اُن کی نوازش آج کل
غیر کو کیوں ہو نہ کاوش آج کل

سخت جانی کا ہماری امتحاں
بخت پر ہے ہم کو نازش آج کل

آفتابِ صبحِ محشر، سوچ لے
دل مرا ہے وقفِ تابش آج کل

فکرِ دنیا، فکرِ عقبیٰ، فکرِ دوست
بڑھ گئی ہے حد سے کاہش آج کل

ان کی خواہش سے بھی اب بیزار ہیں
دل لگی ہے ترکِ خواہش آج کل

گم شدہ فردوس کی ہیں تاک میں
لعلِ لب کی ہے تلاش آج کل

دیکھ نقوی انگبین و قند کی
اُن کے ہونٹوں سے ہے مارش آج کل

۱۳ر اکتوبر ۱۹۷۵ء

○

اب ہم ہیں اور خوابِ پریشانِ آرزو
یعنی بکھر رہا ہے گلستانِ آرزو

تعبیرِ خوابِ شوق ملی اس طرح کہ بس
ہم جیسے ہو گئے کم ہی پشیمانِ آرزو

مایوسیوں سے طاقتِ ضبطِ الم گئی
چھوٹا ہے دستِ شوق سے دامانِ آرزو

لب تک تو آنے سے رہی اب اپنے دل کی بات
سمجھیں ہمیں جو ہوویں سخن دانِ آرزو

شاید وہ آئیں بہرِ عیادت دلِ حزیں
زنجیر در ہو سلسلہ جنبانِ آرزو

اک نقشِ ناتواں بھی کہیں ہو گا راہ میں
ہاں احتیاط بادیہ گردانِ آرزو

○

حسرتِ لذتِ دیدار لیے پھرتی ہے
در بدر، کوچہ و بازار لیے پھرتی ہے

فخر سے بادِ صبا صحنِ چمن میں اے دوست!
کچھ تری شوخیِ رفتار لیے پھرتی ہے

جان و دل، ہوش و خرد اور متاعِ ایماں
کیا کچھ اک نرگسِ بیمار لیے پھرتی ہے

بلبلِ نغمہ سرا کو بھی ملے بار کہ وہ
نذر کو شوخیِ گفتار لیے پھرتی ہے

تیری آواز کی لے، نقشِ کفِ پا کی کشش
قید میں نغمہ و گلزار لیے پھرتی ہے

اے جفاکیش تری کم نگہی کے صدقے
کتنے رُسوا سرِ بازار لیے پھرتی ہے۔

بلقیسِ وقت تھی کبھی پہلو نشین شوق
ہم بھی کبھی رہے تھے سلیمانِ آرزو

تھا وہ بھی ایک دور کہ جب اپنے ساتھ ساتھ
پیماں شکن تھا اور تھے پیمانِ آرزو

نقوی خدا رکھے اُسے اب بھی ہے مہرباں
بس اک وہی رہا ہے نگہبانِ آرزو

۶ اکتوبر ۷۵ء

ہجر میں دیوار و در کو دیکھتے رہیئے مدام
بس یہی اک رہ گیا ہے رات دن اب اپنا کام

زُلف و رُخ کی بات ہی کرتے گزرتی ہے سدا
گردشِ ایام نے بخشی ہے کیسی صبح و شام

قرض کی بھی اب نہیں ملتی کسی عنوان سے
آخرش کب تک کوئی پیتا رہے مے مُفت و دام

ہم نے نقدِ جاں نچھاور کر دیا دہلیز پر
پھر بھی ہم روکے گئے ہے یہ بھلا کیسا اذنِ عام

کاروبارِ شوق تو مدت ہوئی رخصت ہوا
کاروبارِ زندگی بھی ہے قریبِ اختتام

زندگی میں موت ہے اور موت میں ہے زندگی
گر سلیقہ ہو تو سمجھو زندگی کا یہ پیام

اُن کی محفل میں گیا جو بھی ترستا ہی رہا
اِک عنایت ہم پہ تھی ملتے رہے آنکھوں کے جام

قیس و فرہاد اور دامق ایک مدت سے نہیں
لیک نقدی کے سبب باقی ہے اُن کا اب بھی نام

۷ر اکتوبر ۷۵ء

دل خانہ خراب آئے گا
اور ہم پر عذاب لائے گا

مصحفِ رُخ سے اُس کو کیا مطلب
شیخ تو بس کتاب لائے گا

عید کے دن تو آ گلے مل لے
مُفت اجر و ثواب پائے گا

چھوڑ کر تم کو، ان کے لب سے پی
بے حساب و کتاب پائے گا،

ذکرِ جنّت کا منہ سے واعظ کے
حور سے اجتناب لائے گا

حور و جمہور اے معاذ اللہ
کیا نہ تم کو حجاب آئے گا

اُس پری کو نہ چھیڑ اے نقوی
اور دل پر عذاب آئے گا

۸ اکتوبر ۱۹۷۵ء

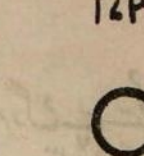

ہوئی جب سے تابندہ تیری جدائی
تبھی سے رہے رخشندہ اپنی کہانی

ہمیں ہم ہیں بس کوئی ہم سا نہیں ہے
تو ہی تو ہے بس اور افسانہ خوانی

نہ بن دردِ دل اِس قدر جان لیوا
بہت دن رہے گی نہ یہ سر گرانی

نگاہوں کے صدقے اشاروں کے قرباں
پیالے پے ملے جائے مے ارغوانی

خلوص مکمّل، عنایت کا ضامن
مسلسل عقیدت بنے مہربانی

رگِ سنگ سے پھوٹ نکلیں شرارے
جو رک جائے اپنے لہو کی روانی

بچو،- ہر رگ و پے سے لُو کے اُٹھیں گے
ہے موجِ تبسّم کی شعلہ فشانی

کرم پر کرم ہے، ستم پر ستم ہے
ستم بھی کرم ہے کہ ہے یارِ جانی

ہواؤں کی زد پر وہ رنگین آنچل
وہ رنگیں ادائیں، وہ رنگیں جوانی

ہے تقدیرِ عاشق میں تہمت ہی تہمت
مُسلسل حکایت، مُسلسل کہانی

جو ہے منکرِ طاقتِ شعر، نقوی
کبھی دیکھے یاروں کی جادو بیانی

۲۳/۲۷ر اکتوبر سنہ ۷۵ء

مری آنکھوں سے اشکوں کی روانی دیکھتے جاؤ
"لہو کس طور سے ہوتا ہے پانی" دیکھتے جاؤ

کھنچی ہے خونِ دل سے کس طرح تصویر جاں کاہی
مرے دامن پہ ٹُک اپنی نشانی دیکھتے جاؤ

ابھی تو ابتدائے عشق ہے اور سرد آہیں ہیں
لہو رُلوائے گی کافر جوانی دیکھتے جاؤ

نہیں لیتے عقیقِ سرخ بھی اشکوں کے بدلے میں
متاعِ کاہشِ غم کی گرانی دیکھتے جاؤ

یہ کس انداز سے چلتا ہے فرماتے ہیں ہنس ہنس کر
مرے ہاتھوں میں خنجر کی روانی دیکھتے جاؤ

ازل سے اک تسلسل ہے حیات و مرگِ عاشق کا
ابھی کب تک چلے گی یہ کہانی دیکھتے جاؤ

نہاں خانوں میں غم کے کیا گزرتی ہے۔ خبر بھی ہے
مجھے دیکھو، مرا سوزِ نہانی دیکھتے جاؤ

کلی کی جان لے کر زندگی بخشی بہاروں کو
ذرا نیرنگیٔ دنیائے فانی دیکھتے جاؤ

ابھی ہوتی ہے اشکِ خوں سے گُل کاریِ ہرِ داماں
ابھی نقوی کی یارو سحر دانی دیکھتے جاؤ

۱۳ نومبر ۷۵ء

لہ یہ مصرع اُستادِ محترم عرشی صاحب قبلہ نے تجویز فرمایا اور غزل کہنے کا حکم دیا۔ نقوی

○

وفورِ شوق میں دیوانہ پن سے کیسے بچیں
زبان کھولیں تو دار و رسن سے کیسے بچیں

چھوئیں جو دستِ حنائی، چنار بن جائیں
مگر بچیں بھی تو اس گل بدن سے کیسے بچیں

قدم قدم پہ ہو جب امتحانِ ظرف تو پھر
تمہیں بتاؤ کہ ہم اس جلن سے کیسے بچیں

سرشتِ آدمِ خاکی ہے محفل آرائی
وہ لاکھ چاہیں مگر انجمن سے کیسے بچیں

بغیر وعدۂ فردا جئیں تو کیسے جئیں
فریبِ الفتِ پیماں شکن سے کیسے بچیں

تمہاری تلخ کلامی کی کوئی حد بھی ہے
بتاؤ، تلخیٔ کام و دہن سے کیسے بچیں

گزاریں رات نہ کیونکر اُسی کی زلفوں میں
اِن آفتوں کے بھلا بانکپن سے کیسے بچیں

گلی میں روک کے اظہرؔ[۱] سے شعر سُنتے ہیں
سخن طرازیٔ شیریں سخن سے کیسے بچیں

جو روز و شب نہ رہیں رہگذر میں اے نقوی
تو پھر بتاؤ کہ بیتِ حزن سے کیسے بچیں

۴ر نومبر لغایت ۷ر نومبر سنہ ۷۵ء

۱۔ اظہرِ عنایتی سلمہٗ کالج میں میرے شاگرد تھے اور اب ایڈوکیٹ ہیں۔ اور جواں سال، خوش فکر شاعر بھی،

ان دنوں جوئے چمن عکسِ ہجومِ گُل سے
کچھ حدیثِ لب و رخسار لیے پھرتی ہے

دوستوں کو تری بیگانہ دشی، اے ظالم
کس قدر جاں سے بیزار لیے پھرتی ہے

آج کل اُن کی نگاہیں جو پھری ہیں نقوی
ہر نظر ہاتھ میں تلوار لیے پھرتی ہے

۲۲/۲۳ مئی ۱۹۷۳ء

اس غزل کے پہلے تین شعر، میرے شعری مجموعہ "چمن جاگے" میں شائع ہو چکے ہیں۔ چونکہ غزل کاغذات میں غلط ملط ہو گئی تھی، اس لیے پوری غزل وہاں جگہ نہ پا سکی اب اس مجموعہ میں شامل کی جا رہی ہے ——— نقوی

○

یوسف نہیں تو مصر کا بازار بھی نہیں
دلدار جب نہیں تو خریدار بھی نہیں

پرسش کہ میری آئیں گے کیسے یقین آئے
انکار گر نہیں ہے تو اقرار بھی نہیں

فرصت کبھی ملے تو کرم اس طرف بھی ہو
کیا ہم حریفِ مرتبۂ دار بھی نہیں

سُنتے تھے مے برستی ہے ان کی نگاہ سے
یہ تو بقدرِ ظرفِ قدح خوار بھی نہیں

میخانہ مٹ گیا تو ہمیں غم ہو کیوں ندیم
کیا دست رس میں خانۂ خمار بھی نہیں

ہم سے چمن ہے دوست، چمن سے نہیں ہیں ہم
جب ہم نہیں تو جانیے گلزار بھی نہیں

کیا جائیں دشتِ شوق کو نقوی کہ راہ میں
مہماں نواز کہنے کو اک خار بھی نہیں

۹ نومبر ۷۵ء

○

"تری زلفوں کا پیچ و خم نہیں ہے"
تو دل کے زخم کا مرہم نہیں ہے

ابھی کچھ اور بھٹکے گا زمانہ
نظامِ دل ابھی محکم نہیں ہے

نہ سمجھو گے ہمارے آنسوؤں کو
تمھاری چشم گریہ نم نہیں ہے

ہوئیں صدیاں کہ خوں اپنا بہا تھا
مگر پھر بھی شفق مدھم نہیں ہے

تمہارا حسن روز افزوں ہے، لیکن
ہمارا عشق بھی کچھ کم نہیں ہے

امانت دار ہے تیری خودی کا
یہ دل ہے، کوئی جامِ جم نہیں ہے

نہیں یہ انکسارِ عجز، قاتل
وبالِ دوش ہے سر خم نہیں ہے

تنِ جاں کے تو رشتے آج بھی ہیں
مگر سازِ نفس محکم نہیں ہے

یہ کیوں نظمِ دو عالم ہے دگرگوں
کسی کی زلف تو برہم نہیں ہے؟

ازل سے ہے ابد تک وہی عالم
مگر کیا ہے کہ وہ عالم نہیں ہے

حریمِ ناز کے لائق بناؤ
تو چشمِ شوق نامحرم نہیں ہے

نہیں ہے دل پہ اپنے اب بھی قابو
مگر وہ شوق کا ادھم نہیں ہے

یہ نقشِ نیم نگاہوں سے کسی کی
یہ اَمرت ہے یہ کوئی سم نہیں ہے

۹ دسمبر لغایت ۱۰ دسمبر ۷۵ء

○

مکاں اور بھی ہیں، زماں اور بھی ہیں
ترے شوق کے رازداں اور بھی ہیں

لبِ شکوہ سنجِ محبّت، نہ گھبرا
ترے بزم میں ہم زباں اور بھی ہیں

درِ میکدہ ہے اگر بند واعظ
خدا رکھّے، پیرِ مغاں اور بھی ہیں

اگر اک کماں کش نے نظریں چُرائیں
تو دنیا میں ابرو کماں اور بھی ہیں

نہ اِترائیں اوراقِ گل پر عنادل
کہ زیبِ چمن گل رخاں اور بھی ہیں

نہیں خاتمِ شوق فرہاد و مجنوں
طلب گارِ کوئے بتاں اور بھی ہیں

غزالانِ رم خوردہ و شوخ دیدہ
حسینانِ آہو وشاں اور بھی ہیں

بہت مست چہکِ قمریٔ سروِ خوبی
گرفتارِ طوقِ گراں اور بھی ہیں

فقط ایک مظہر نہ تھا جانِ جاناں
عزیزو، ابھی جانِ جاں اور بھی ہیں

لٹا دی مئے خونِ دل پھر بھی نقدی
طلب گارِ رطلِ گراں اور بھی ہیں

۱۱/۱۳ دسمبر ۷۵ء

THIS EBOOK IS DOWNLOADED FROM
SHAAHISHAYARI.COM

LARGEST COLLECTION OF URDU
SHERS, GHAZALS, NAZMS AND EBOOKS.

○

غمِ دوراں کا اگر کوئی مُداوا ہوتا
تیرا غم پھر تو مرے حق میں مسیحا ہوتا

ہو کے شرمندہ بھی تم کتنے بھلے لگتے ہو
دیکھ کر مجھ کو کبھی آئنہ دیکھا ہوتا

تیرے اخلاص پہ ہے ہم کو بھروسہ کتنا
غیر سچا بھی جو ہوتا تو وہ جھوٹا ہوتا

دل میں اک درد جو اُٹھتا ہے تو کیا چاہتا ہے
کسی مایوسِ کرم کو بھی تو دیکھا ہوتا

چارہ گر، بخیہ گری تیری مبارک تجھ کو
زخمِ دل کو مرے کچھ اور کریدا ہوتا

ہم بھی آئے ہیں ابھی اُس کی عیادت کر کے
غیر کا حال ذرا ہم سے بھی پوچھا ہوتا

خوب مِل مِل کے گلے روتے ہم اے نقوی
کاش، ہم سا کوئی مایوسِ تمنّا ہوتا

۱۹ جنوری ۷۶ء

○

دل ناداں کو کیا ہوا، جانے
کس پہ آیا، کہاں گیا، جانے

آج پھر درد دل میں اُٹھتا ہے
آئے کوئی، اگر دوا جانے

کوئی دل کی لگی کو کیا سمجھے
میرا دل جانے یا خُدا جانے

تیرا دیوانہ ہو گیا خاموش
زیرِ لب کہہ کے کیا، خُدا جانے

بندگی ہے کہ خود نُمائی ہے
بندگی کاش خود نُما جانے

ہے ازل سے حیات گرمِ خرام
کب رُکے گا یہ قافلا جانے

عشق کی اِبتدا کِسے معلوم
کون اِس دُکھ کی انتہا جانے

کِسے یارا کہ اس مرض سے بچے
کس کو قُدرت کہ کچھ دوا جانے

میں نے پوچھا "جو کیوں خفا ہیں جناب"
ہنس کے بولے "مری بلا جانے"

چاندنی ہے کہ ڈس رہی ہے مجھے
آئے کب تک وہ مہ لقا جانے

دردِ دل ہم سے کیوں چھپاتے ہو
"دردِ دل درد آشنا جانے"

کبھی ہم سے تو بات کی ہوتی
آپ سے کس نے کیا کہا، جانے

○

دل ہی نہیں تڑپے نہ جو دکھلائی دے قاتل اگر
آنکھیں نہیں اس حسن سے ہوتیں نہیں بسمل اگر

مایوسیوں کے خوف سے اتنے شکستہ دل ہیں ہم
منجدھار کا تو ذکر کیا، ڈوبیں ملے ساحل اگر

میں نے کہا کچھ بھیک ہی مل جائے تیرے حسن کی
بولا کہ کچھ مشکل نہیں ہووے کوئی سائل اگر

چڑھتے ہوئے سورج ہی کو انساں نے مانا تھا خدا
تیری خدائی تھی کہاں ہوتا نہ وہ غافل اگر

ذوقِ جنوں، زنجیرِ در کھڑکا کے رخصت ہو گیا
کھلتا درِ زنداں ابھی ہوتا نہ میں غافل اگر

محفل جمی ہے جب تلک وہ رونقِ محفل نہیں
پھر رونقِ محفل کہاں ہو رونقِ محفل اگر

پھر چلا ہوں میں جنگاؤں کی طرف
دل میں آئی ہے میرے کیا جانے

لِلّٰہ الحمد راہ پر لائے
اب تو وہ جانے مُدّعا جانے

ایک مُدّت سے لَو لگائی ہے
اب اثر جانے اور دعا جانے

کب طلب ہو ہماری اے نقوی
کب ملے خاکِ کربلا جانے

۲۰ر فروری لغایت ۲۷ر فروری ۷۶ء

○

کم تر مجھے نہ جان، جو بہتر نہیں ہوں میں
کیا تیرے سنگِ در کا بھی ہم سر نہیں ہوں میں

محتاج کیوں ہوں آئینے کا اپنی دید کو
ہوں خود شناس، گرچہ سکندر نہیں ہوں میں

چہرے تمام کھولتے ہیں مجھ پہ حالِ دل
مانو مری اگرچہ پیمبر نہیں ہوں میں

اب رحم میرے حال پہ اے چشمِ خوں چکاں
کب تک بجھاؤں پیاس، سمندر نہیں ہوں میں

اللہ بہ بھر دسر بھی ہے خودگری کے ساتھ
اوروں کی مثل اپنا مقدر نہیں ہوں میں

بیکار ہیں تمہاری یہ افسوں طرازیاں
موسیٰ مثال ذرہ بھی ششدر نہیں ہوں میں

صد شکر مالِ غیر پہ میری نظر نہیں
دل کا غنی ہوں گرچہ تونگر نہیں ہوں میں

اک کافرِ زمانہ کے در پر گزار دی
اس پر بھی لوگ کہتے ہیں کافر نہیں ہوں میں

نقوی مری غزل نے اُڑایا اسد کا رنگ
گو اُس کی خاکِ پا کے برابر نہیں ہوں میں

۲۸ فروری ۷۶ء

○

بس ایک شوق میں کھائے ہزار ہا پتھر
کہ کاش ہو دے کوئی تیرے ہاتھ کا پتھر

وہ بُت ملے ہیں کہ اللہ یاد آتا ہے
خودی سے بن گئے کیا کیا خدا نما پتھر

چہار سمت تھے مشتاق دیدِ حُسن مگر
نگہ اُٹھی تو نظر آئے جا بجا پتھر

ہمارا دل ہی تھا جو ہو سکا حریفِ کرم
وگرنہ برقِ تبسّم سے جل گیا پتھر

فروغِ حُسن کی نیرنگیوں کا کیا کہنا
عقیق و لعل و زمرد ہیں بے بہا پتھر

کھُبے ہیں دل میں مرے کچھ سبب تو ہے یارو!
بنے ہیں جنسِ گراں پا کے نقشِ پا پتھر

نہ جاؤ حسن کی گل بازیوں پہ دل والو!
کہ ایسے کھیل کی ہوتی ہے انتہا پتھر

کمالِ بندگیٔ عشق بے نیاز نہ پوچھ
کسے خبر، کہ کدھر آیا، کہاں لگا پتھر

نہ جانے حال ہو کیا اُس خبر پہ اے نقوی
کہ جس خبر کا ابھی سے ہے مُبتدا پتھر

نوٹ - یہ غزل آج شب میں تقریباً دس بارہ دن بعد مکمل ہو

۱۰ر مارچ ۵۶ء

جملہ حقوق
بیگم نجم الدین نقوی کے لیے محفوظ ہیں

بار اول .... اکتوبر ۱۹۷۷ء

تعداد اشاعت .... دو سو پچاس

قیمت .... دس روپے

ناشر .... سید صفدر رضا نقوی

۱۲-۱ اے۔ قلعہ۔ رام پور
(یو۔ پی)

طباعت .... ناظم پریس رام پور

ملنے کے پتے

(۱) ادارہ فروغ اردو (۲) دانش محل۔ امین آباد لکھنؤ

محو رہنے ہیں فقر کے بیگانۂ منزل ہیں ہم
ٹھوکریں نہ ماریں اک ذرا چومے قدم منزل اگر

مجنونِ صحرا گرد کو جوشِ جنونِ عشق میں
لیلیٰ دکھائی دے عیاں خالی ملے محمل اگر

نقوی ہمیں یہ زندگی رہ رہ کے دیتی ہے صدا
اسفل مقدر ہے ترا سائل پہ ہو مائل اگر

۱۶ر جون ۷۴ء

نوٹ۔ یہ زمین استاد محترم عرشی صاحب نے تجویز فرمائی اور غزل کہنے کی فرمائش کی۔

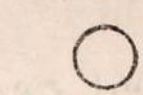

دل میں پھر اُن کی یاد آئی
پھر پردے میں ہم نے چوٹ کھائی
یارانِ طریقت اور بھی ہیں
اُن کی نظرِ دل کی شہ جو پائی
ہم نے دیکھیں جو اُن کی آنکھیں
دُنیا آنکھوں میں کب سمائی
اے عشق غیور تیرے صدقے
کیسی کیسی ہے چوٹ کھائی
آشوبِ حیات، اللہ اللہ
آہٹ قدموں کی مل نہ پائی
غیروں نے لگا کے دل پہ چرکے
تفریقِ شما و من مٹائی
آغوشِ وفا کھلا ہوا ہے
شرمائے کبھی تو بے وفائی
اپنی چالوں سے زچ ہوئے خود
سادہ دل نے نہ مات کھائی

دل کی جو ہو بات دل میں رکھو
مُنہ سے نکلی ہوئی پرائی
اک چُپ سی لگی ہے ان دنوں کچھ
کیا جانیے کس کی یاد آئی،
بھیگی زلفیں جو اُس نے کھولیں
بدلی ساون کی گھر کے آئی
آنکھوں میں مری تارے ڈوبے
اُس شوخ کو خوب نیند آئی
اک لمحہ ہزار کرب و راحت
تیرا ملنا تری جُدائی
ناصح کا علاج ہاتھ آیا
جب بھی بہکا اُسے پلائی

نقوی نے کہا تھا جو، کیا وہ
رویا کرے اب اُسے خدائی

۲۰ جون ۷۴ء

○

اس طرح گردشِ ایام سے باتیں کی ہیں
جیسے اک شوخِ گل اندام سے باتیں کی ہیں

عمر بھر بوالہوسوں ہی سے رہے محوِ کلام
تم نے کب عاشقِ ناکام سے باتیں کی ہیں

ہم بھی ہیں محرمِ اسرارِ حیاتِ ابدی
ہم نے بھی خضرِ خوش انجام سے باتیں کی ہیں

ہم بھی گزرے ہیں نظاروں سے رُخ وگیسو کے
یوں بھی ہم نے سحر و شام سے باتیں کی ہیں

اُکھڑے اُکھڑے سے نظر آتے ہو کچھ آج ہمیں
خیر ہے کیا کسی نمّام سے باتیں کی ہیں

حُسن جب عشق بنے اور قیامت ڈھائے
نہ گیا میں تو مرے نام سے باتیں کی ہیں

اُن کے درباں بھی قیامت کی نظر رکھتے ہیں
کیا کبھی اور بھی دُخشام سے باتیں کی ہیں

گردشِ چشمِ سیہ مست کا اللہ رے فیض
ہم نے بھی حافظ و خیام سے باتیں کی ہیں

جب بھی آئے ہیں نظر، جب بھی ملیں ہیں آنکھیں
کبھی شیشے سے کبھی جام سے باتیں کی ہیں

آج جامے میں سماتے نہیں اپنے نقوی
کیا کسی شوخِ گل اندام سے باتیں کی ہیں

۲۱ لغایۃ ۲۸ جون ۷۴ء

○

اے دل تری طرف سے سوالات تو چلے
پر اُن کی بزم ناز میں کچھ بات تو چلے

آساں نہیں ہیں طوق و سلاسل کی منزلیں
تپتی ہوئی زمیں پہ کوئی سات تو چلے

داغ جگر کی بات تو پہنچے وہاں تلک
یا روک کی سمت سے کوئی سوغات تو چلے

دشتِ جنوں و خارِ مغیلان و نصلِ گل
دامان و جیب سب ہیں مگر ہات تو چلے

رطلِ گران و ابرِ بہاران و سیرِ گل
سب کچھ بہم ہے جلووں کی برسات تو چلے

مژدہ نہ دو ہمیں چمن افروز صبح کا
کوشش کرو کہ ٹھہری ہوئی رات تو چلے

ممنون ہوں کہ وعدۂ فردا وفا کیا
پر دوست اب تلافیِ مافات تو چلے

منکر نہیں ہوں اپنی خطا کا مگر قدیر
تجھ کو بھی فکر تھی کہ تری بات تو چلے

نقوی تری نوا سے جلے دیپ ہر طرف
تاریکیوں کی بزم کے لمحات تو چلے

۲۵ جون ۷۴ء

○

آج کیوں بند ہے میخانے کا در اے ساقی
کیا پھری رندوں سے پھر تیری نظر اے ساقی

تو سلامت رہے، مے مجھ کو ملے یا نہ ملے
جام بھر دیں گے مرے دیدۂ تر اے ساقی

ہم بھی تھے "ایک عنایت کی نظر ہوتے تک"
نہ ہوئی، پر نہ ہوئی ایک نظر اے ساقی

ہم نے تفریقِ بد و نیک سے چاہی تھی پناہ
میکدے میں بھی نہیں اُس سے مفر اے ساقی

پھر چلے شہرِ نگاراں کی طرف لب تشنہ
مے کسے پینے کو بہ عنوانِ دگر اے ساقی

وہ نظر کون و مکاں سے جو پرے جاتی تھی
تجھ کو دیکھا تو رُکا اس کا سفر اے ساقی

لاکھ ہو آتشِ سیّال پہ وہ بات کہاں
اُس کی آنکھوں میں جو ہے آتشِ تر اے ساقی

میکدہ تنگ دلوں سے کبھی آباد ہوا؟
حضرتِ شیخ نکل آئے کدھر اے ساقی

تو اگر چاہے کہ نقوی سے یہیں بنتی رہے
اُس بلا نوش سے کر صرفِ نظر اے ساقی

۲۷ جون ۷۴ء

○

اُلجھے ہوئے معاملے دل کے سلجھ ہی جائیں گے
سوزِ دروں کی خیر ہو، آئیں گے پھر وہ آئیں گے

کوششِ ناتمام تک کشمکشِ حیات ہے
جب بھی سکون مل گیا آپ کو ہم نہ پائیں گے

اُن کے حریمِ ناز کی بات ہی اور ہے، مگر
اپنے حریمِ ناز میں کاہے کو وہ بُلائیں گے

قطعِ تعلقات سے دونوں طرف بہیں گے اشک
ہم ہی فقط نہ روئیں گے آپکو بھی رُلائیں گے

کس کو یقیں تھا عشق میں ایسی گھڑی بھی آئیگی
یاد ہے جس کی ہر گھڑی اُسکو بھی بھول جائیں گے

روز کے خرخشے مٹیں، روز منانے سے بچیں
آپ سے کیوں نہ روٹھ جائیں، کب تک اُنھیں منائیں گے

مُعلمِ مرحوم

پروفیسر سیّد ضامن علی صاحب

مؤسس و صدرِ اول شعبہ اُردو

الہ آباد یونیورسٹی

کے

نام

دہم ہے یہ دلِ حزیں اِس کا علاج کچھ نہیں
کہنے کی بات ہے فقط، آئیں گے وہ نہ جائیں گے

عشق امامِ عاشقاں، وجہِ سکونِ دل رہے
تیرگیِ لحد میں بس شمعیں وہی جلائیں گے

خاکِ نجف سے بہرہ مند خاکِ صفا سے کامیاب
نقویؔ خاکسار کو دُرِّ نجف بنائیں گے

۲۷ تا ۲۹ جون ۷۴ء

○

ہم ہیں اور چاروں طرف اک لالہ زارِ نغمہ ہے
بلبلِ خستہ جگر ہے اور بہارِ نغمہ ہے

تم بھی سُن سکتے ہو گر ہو گوشِ دل سے بہرہ یاب
قطرۂ اشکِ ندامت جوئے بارِ نغمہ ہے

ہائے اُس شیریں نوا کے زمزمے جن کے بغیر
مجمعِ سیلِ حوادث، رودبارِ نغمہ ہے

تم نے دیکھا ہے کبھی اس شوخ کو گرمِ سخن
اُس کے دم سے آبرو و اعتبارِ نغمہ ہے

جب سے مضرابِ مژہ نے ہم سے نظریں پھیر لیں
دل کے تاروں میں فقط اب انتشارِ نغمہ ہے

کم سخن کی بزم میں یوں گوش برآواز ہیں
جو نہیں دیکھے وہ سمجھے انتظارِ نغمہ ہے

سُن کے تیرا لہجۂ تاکید قتل بوالہوس
عاشقوں کے دل سے نکلا شاہکارِ نغمہ ہے

وہ ترنم خیز مدّ و جزر لحنِ گل بدن
ہم کو اب آہنگِ بلبل خلفشارِ نغمہ ہے

جڑ دیئے آواز کے شعبوں سے ربط میں نگیں
وہ بُتِ کافر غضب کا سادہ کارِ نغمہ ہے

نقدِ ہی نغمہ سراب پھینک بھی دے عود و چنگ
دیکھ تیرے سامنے وہ نوبہارِ نغمہ ہے

۲۹ جون ۷۴ء

○

اے شوق کے متوالے، کچھ تجھ کو خبر بھی ہے
اک تو ہی نہیں، رسوا، وہ رشکِ قمر بھی ہے

دل آئینۂ محفل اور محفل آئینہ
دیکھو، مری آنکھوں میں آئینۂ تر بھی ہے

اے شعلۂ جوالہ ٹک ساتھ اُسے بھی لے
مدت سے تمنا میں اک خاک بسر بھی ہے

دل تیری کشاکش سے آئے تو مرے گھر وہ
چہرے پہ مگر اُن کے کچھ گردِ سفر بھی ہے

میں اُن کا ہوں شیدائی مجھ سے اُنھیں نفرت ہے
دنیائے محبت میں جنت بھی، سقر بھی ہے

اس وعدۂ فردا کا کیا خاک یقیں آئے
لب پر تو ترے ہاں ہے آنکھوں میں مگر، بھی ہے

آئینۂ معنی پہ کی ہم نے جلا نقوی
اب بھی جو نہ ہو قائل پوچھو کہ نظر بھی ہے

۱۴ جولائی ۷۴ء

○

نہ ہم کسی کے لیے ہیں نہ تم کسی کے لیے
بنے ہیں دونوں محبت کی زندگی کے لیے

خدائے عشق کرم ہو کہ دم نکلتا ہے
بتانِ دیدہ و دل کچھ تو آزری کے لیے

سحر سے شام تلک عقل کے دھندلکے میں
بھٹکتے پھرتے ہیں ہم دل کی روشنی کے لیے

وفورِ شوقِ تکلم سے چپ ہوئے تھے کبھی
ترس رہے ہیں اسی دن سے خامشی کے لیے

مرے سوالِ تمنا پہ ہنس کے چپ رہنا
یہ دل لگی کے لیے تھا کہ دل لگی کے لیے

ہمارے جذبِ نظر کی کرامتیں دیکھیں
یہاں تم آئے تھے بس ایک دو گھڑی کے لیے

یہ درد دل تو بڑے کام کی ہے چیز اے دوست
مگر ہے شرط کہ کام آئے آدمی کے لیے

نہ تھا یہ علم کہ ہنسنے میں جان جاتی ہے
کلی شگفتہ ہوئی تھی اِس آگہی کے لیے

مرے سرشکِ تبسم کا راز کیا سمجھو
یہ دل لگی کے لیے ہے نہ بے دلی کے لیے

نہ دیکھو طور کی جانب، حذر کرو نقوی
مآلِ جرأتِ موسیٰ ہے روشنی کے لیے

۱۷ر جولائی ۶۷ء

○

تم آئینہ سیما ہو تو آئینہ دکھاؤ
ٹک دیکھیں ہم اپنے کہ ذرا پاس تو آؤ

غیروں کی طرف دیکھو تو دامن کو بچاؤ
مانندِ نگہ پاس رہو، دُور جو جاؤ

نیچی رکھو نظروں کو تو ہو جان خلش میں
آنکھیں جو ملیں اُن سے تو پھل برچھی کے کھاؤ

گھر بیٹھیں تو صحرا ہمیں آواز لگائے
صحرا کو جو جائیں تو کہے گھر کو بلاؤ

گر گھر کو لگی آگ تو صحرا بھی جلے گا
سینہ جو بچانا ہے تو پھر دل بھی بچاؤ

مجبوریٔ اُلفت کے تقاضے ارے توبہ
گر دل میں لگے آگ تو اُف لب پہ نہ لاؤ

بس دور سے نظارہ کرو مہر وشاں کا
نظارے کو سورج کی شعاعوں سے بچاؤ

اپنا دلِ صد چاک ہے خود رشکِ گلستاں
سی پارۂ گل چیز ہے کیا بھول بھی جاؤ

نقوی سے ملاقات نہیں ہوتی ہے یارو
دیوانے کی کچھ خیر خبر ہم کو بتاؤ

۱۹ر جولائی ۶۷ء

زندگی بھر اک نگاہِ ناز کے مارے رہے
دیدہ و دل، ابروئے خم دار پہ وارے رہے

تھا بھروسہ ہم کو ضبطِ غم پہ اپنے کس قدر
کیوں دلِ ناداں ترے اب صبر کے یارے رہے

مہ وشوں کے عکسِ رخ سے دل سدا روشن رہا
روز و شب اپنے تصور میں یہ مہ پارے رہے

آرہے تھے عجلت میں میرے گھر وہ لیکن جذبِ دل
ہے ترا احساں کہ ٹھہرے میہماں بارے رہے

دردِ ہجراں، سوزِ فرقت، ضبطِ غم، ہوش و حواس
سب گئے کچھ اس طرح جی سے کہ بیچارے رہے

نقوی جاں باز اک مدت ہوئی دم دے چکا
جاں سپاروں میں مقابل تھے جو وہ ہارے رہے

۲۲/ جولائی ۱۹۶۲ء

کسیکہ حسنِ رخِ دوست در نظر دارد
محقق است کہ او حاصلِ بصر دارد

(حافظ)

○

غمِ جاناں، غمِ دوراں میں نہاں ہے کہ نہیں
میرا افسانہ حدیثِ دگراں ہے کہ نہیں

ایک مدت سے نہیں کچھ خبرِ آوارہ
دیکھو دیوانہ سرِ کوئے بتاں ہے کہ نہیں

یارو انصاف کرو، کچھ تو خدا لگتی کہو،
بولو وہ شوخ مرا جانِ جہاں ہے کہ نہیں

کل کی ہے بات کہ سائے کی طرح ساتھ تھے جو
آج سایہ بھی مرا اُن پہ گراں ہے کہ نہیں

میرے مرنے پہ وہ تڑپے تو تعجب کیوں ہے
شعلۂ شمع سرِ بزم تپاں ہے کہ نہیں

دلِ بے خود، تری باتوں پہ ہنسی آتی ہے
تیرا افسانہ فقط وہم و گماں ہے کہ نہیں

غمِ جاناں کا مُداوا تو میسّر نہ ہوا
کچھ علاج غمِ دوراں بھی یہاں ہے کہ نہیں

آپ ہی آپ یہ دل چُور ہوا جاتا ہے
"کچھ علاج اس کا بھی اے شیشہ گراں ہے کہ نہیں"

آنکھ ملتے ہی شگفتہ ہوا رُوئے دنیا
کہیئے یہ معجزۂ خُوش نظراں ہے کہ نہیں

ہم نہ کہتے تھے کہ اب بنتِ عنب کو چھوڑو
ایک ہنگامہ سرِ رطلِ گراں ہے کہ نہیں

ہم ہتھیلی پہ لیے سر کو یہاں آئے ہیں
تاک میں اس کی کوئی دشمنِ جاں ہے کہ نہیں

کیوں ہوا جاتا ہے پردے سے تو باہر نقوی
سوچ تو خلوتیٔ رازِ نہاں ہے کہ نہیں

۲۳ر جولائی ۷۴ء

○

رُوئے زیبا کے مقابل ہے؟ یہ نادانی ہنوز
آئینے کے بخت میں لکھّی ہے حیرانی ہنوز

ابنِ آدم کو یہ سمجھاؤ کہ عقلِ خام سے
ہے مآلِ سعیٔ انسانی، پشیمانی ہنوز

اُن کے نقشِ پا پہ جم کر رہ گئیں کچھ اس طرح
لوگ سمجھے ہیں مری نظروں کو زندانی ہنوز

اپنے در کو آستانِ یار ہیں سمجھے ہوئے
دیدۂ بے خواب ہیں مصروفِ دربانی ہنوز

الحذر اے شیشہ بازانِ جہانِ آب و گِل
ہے ہمارے دل میں پنہاں آہِ پیکانی ہنوز

دل ہوا جاتا ہے خوں ہر لمحہ تیری یاد میں
فرض ہے مژگانِ چشمِ دوست، مہمانی ہنوز

نقوی آشفتہ سر، آشفتہ خو، آشفتہ مو
صبر کر، گر ہے مقدر میں پریشانی ہنوز

۲۴ جولائی ۷۴ء

○

سر میں سودا نظر آتا ہے خدا خیر کرے
گھر بھی صحرا نظر آتا ہے خدا خیر کرے

آج بگڑے ہوئے تیور ہیں کچھ ان کے یارو
ہم کو کیا کیا نظر آتا ہے خدا خیر کرے

ہے بلا خیز پھر ایک بار تموّج دل میں
خوں برستا نظر آتا ہے، خدا خیر کرے

ہم سے کہتے ہو اندھیروں کو اُجالے سمجھو
شب پرو! کیا نظر آتا ہے، خدا خیر کرے

آج کیا اُن کے تصور میں بہیں گے پھر اشک
غم کا دریا نظر آتا ہے، خدا خیر کرے

تھا جگر، تشنۂ فریاد تو دم گھٹتا تھا
دل بھی پیاسا نظر آتا ہے خدا خیر کرے

سامنے تھے تو نظر رُخ سے نہیں ہٹتی تھی
اب تو پردا نظر آتا ہے، خدا خیر کرے

چھوٹ تھی جلوۂ پیہم کی تو اندھیر سا تھا
اب اندھیرا نظر آتا ہے خدا خیر کرے

ہم کو ان سر بہ فلک قصر و عمارات کے گرد
غم کا ڈیرا نظر آتا ہے خدا خیر کرے

نقوی تشنہ جگر کی بھی بجھے کی کبھی پیاس
اب تو مرتا نظر آتا ہے، خدا خیر کرے

۲۵ جولائی ۷۴ء

○

آئینے کے سامنے کاکل جو سُلجھانے لگے
خُود بخود اپنی جگہ پر آپ بل کھانے لگے

آبلہ پائی کی لذت سے رہا محروم دل
خار ہائے دشت بھی ہم پر ترس کھانے لگے

میرے شانوں پر تری زلفیں پریشاں دیکھ کر
سینۂ دشمن پہ گویا سانپ لہرانے لگے

اُن کی بزمِ ناز سے اُٹھیں جو تفریقیں تمام
بوالہوس بھی اُس طرف آنے لگے جانے لگے

یادِ برگِ لب نے سینے میں لگا دی آگ سی
جامہ ہائے گل بھی ہم پر آگ برسانے لگے

ہم نے سمجھا تھا مٹے گا کفر و دیں کا تفرقہ
اُن کے گیسو مسئلے کو اور الجھانے لگے

اِن بُتوں سے خیر کی اُمید رکھیں کس طرح
توڑ کر دل جب بِنائے کعبہ یہ ڈھانے لگے

آئینے کے سامنے آئی جو انگڑائی اُنھیں
ایسے کچھ بے خود ہوئے اپنے سے شرمانے لگے

کچھ سمجھتے ہوئے جمالِ ہم نشیں کے فیض سے
حضرتِ نقوی بھی اب تو ناز فرمانے لگے

۲۶ جولائی ۷۴ء

○

جو آفتاب شمائل دکھائی دیتا ہے
ہمارے واسطے قاتل دکھائی دیتا ہے

ہمیں نے خونِ تمنّا نہیں کیا ہے فقط
تمام شہر مماثل دکھائی دیتا ہے

یہ کس مقام پہ لے آئیں حسرتیں ہم کو
کوئی بھی دارِ منزل دکھائی دیتا ہے

وہ لوگ بحرِ محبت کے کب شناور ہوں
ہر اک قدم جنھیں ساحل دکھائی دیتا ہے

ہمارے ذوقِ جنوں کی ملے بھی داد کہاں
کوئی بھی شہر میں قاتل دکھائی دیتا ہے،

کسی اُمید پہ جینے کی ہم نے ٹھانی تھی
پہ اب تو مرنا بھی مشکل دکھائی دیتا ہے

گرہ کشائی زُلفِ نگارِ صبحِ چمن
ہمیں تو عقدۂ مشکل دکھائی دیتا ہے

ہماری غیرتِ دیوانگی کو کب ہے پسند
کہ آئنے میں مقابل دکھائی دیتا ہے

وہ دیدہ جو کبھی تیری طرف ہوا تھا وا
ہمیں تو دیدۂ بسمل دکھائی دیتا ہے

یہی تو اپنا سویدائے قلب ہے یارو!
کسی کے چہرے پہ جو تل دکھائی دیتا ہے

وفورِ شوق کی کچھ انتہا بھی ہے نقوی
تو سر سے پاؤں تلک دل دکھائی دیتا ہے

۲۷ جولائی ۷۴ء

پیش لفظ

از۔ سید شبیہ الحسن صاحب۔ ڈی لٹ۔ صدر شعبۂ اُردو، لکھنؤ یونیورسٹی

زیرِ نظر مجموعۂ غزلیات جناب سید نجم الدین نقوی صاحب کی طبع رسا اور کلک رواں کا نقش ثانی ہے۔ ان کے دونوں ہی مجموعے اپنے اندرونی ربط و تسلسل اور فنکارانہ یک جہتی کی بنا پر اگرچہ ایک ہی سکّے کے دو رُخ معلوم ہوتے ہیں پھر بھی ایک بالبصیرت مطالعہ کرنے والا یہ محسوس کیے بغیر نہیں رہ سکتا کہ زبان و بیان خیالات کی پختگی اور تاثیر کے اعتبار سے نقشِ ثانی کو نقشِ اوّل پر برتری حاصل ہے اور یہ اس بات کی علامت ہے کہ بنیادی یکسانیت کے باوجود ان کی فکر و فن میں ارتقار کا عمل بارآور شکل میں جاری ہے۔

نقوی صاحب ایک ایسے خانوادہ کی فرد ہیں جو عرصۂ دراز سے اودھ اور اُس کے اطراف و جوانب میں اپنے علمی اکتسابات، اخلاقی فضائل اور ادبی ذوق و بصیرت کے لیے شہرت رکھتا ہے

○

نگاہِ ناز سے بجلی گرا کے دیکھو تو
ہمارا ظرف کبھی آزما کے دیکھو تو

جو بن پڑے تو اُٹھاؤ نقابِ رُخِ حیات
رُخِ نگار سے پردہ ہٹا کے دیکھو تو

نہ آؤ تم مرے گھر کی طرف پہ یہ تو کرو
ملو جو راہ میں، نظریں بچا کے دیکھو تو

گرو نہ اہلِ وفا کی نظر سے تب جانیں
نظر سے اپنی ہمیں تم گرا کے دیکھو تو

فقط ہیں کہنے کی باتیں حقیقت اور مجاز
نہ جھانکو آئنے میں، پاس آ کے دیکھو تو

یہ تو رطلِ گراں واعظِ کرم فرما
کسی کی آنکھ سے ٹک ڈگمگا کے دیکھو تو

ورق ورق ہے چمن زارِ حرفِ راز مگر
"نقابِ عارضِ معنیٰ"[لہ] اُٹھا کے دیکھو تو

نہیں ہے وقت کہ روٹھیں تو پھر وہ من نہ سکیں
ہزار بار مناؤ، منا کے دیکھو تو

وہ کہتے ہیں کہ لگاوٹ نہیں اُنھیں نقوی
ذرا تم اُن کی طرف مُسکرا کے دیکھو تو

۳۰ر جولائی سنہ ۶۸ء

لہ موتی میاں ثروت رامپوری کا مادۂ تاریخ جو میرے پہلے مجموعۂ شعری "چمن جاگے" کے لیے اُنھوں نے ازراہِ کرم پیش فرمایا۔ نقوی

○

نظر بچا نہ سکیں، دل پہ چوٹ کھا نہ سکیں
بلائے بن نہ بنے اور اُنھیں بلا نہ سکیں

سکونِ دل جو میسر بھی ہو تو کیوں کر ہو
نظر ملائیں جو اُن سے تو تاب لا نہ سکیں

وہ قطرہ ہائے گُہر کس کے کام آئیں گے
چمن کے پھولوں پہ جو آب و تاب لا نہ سکیں

ہمارے داغِ جگر کی وہ داد کیا دیں گے
نگاہِ مہر سے چرکے بھی جو لگا نہ سکیں

جنوں طرازیِ تخئیلِ لالہ کا را تجھے
گلے لگا کے بھی دل کا چمن کھِلا نہ سکیں

کسی کی انجمنِ ناز میں جگہ جو ملے
نظر اُٹھا نہ سکیں اور لب ہلا نہ سکیں

فقیہہ شہر بہاتے ہیں جوئے شیر و عسل
مگر مزاج کی تلخی سے باز آ نہ سکیں

ہمارے جذبۂ صدق و صفا کو کیا سمجھیں
ریا و کذب سے دامن کو جو بچا نہ سکیں

ہمارا عشق ابھی خام کار ہے نقوی
کہ خود تو روئیں مگر اُن کو ہم رُلا نہ سکیں

۲۳ جولائی سنہ ۷۴ء

نوٹ۔ یہ غزل اور گزشتہ غزل دونوں ۲۳ جولائی سنہ ۷۴ء کو میل سے لکھنؤ جاتے ہوئے کہی گئیں۔ واپسی پر اُستادِ محترم عرشی صاحب کی خدمت میں بہ غرض اصلاح ارسال کی گئیں اور جب بعد اصلاح واپس آئیں تو موصوف نے یہ جملہ درج فرمایا ——— ماشاء اللہ چشم بد دور! ۶-۸-۷۴

عرشی

○

مدتوں بیٹھے نگہ کاروں کے بیچ
اک گھڑی بھر کو گنہ گاروں کے بیچ

شعلۂ رخ سے دہکتے ہیں چمن
جل رہے ہیں ہم چمن زاروں کے بیچ

ہم نے بھرتی ہیں نگاہیں یار کی
زندگی گزری ہے تلواروں کے بیچ

دل کتاں ہو چاند سے مکھڑوں کو دیکھ
کاش گزرے اپنی مہ پاروں کے بیچ

گُل عذاروں کے تصور میں سدا
نیند آئی ہم کو انگاروں کے بیچ

دردِ دل، دردِ جگر، دردِ فراق
کیا جئیں گے ہم ان آزاروں کے بیچ

بلبل و قمری کے نالے من لگے
ہم بھی جا بیٹھے دل افگاروں کے بیچ

وادیٔ مژگاں میں تب رکھو قدم
جب گزارا کر سکو آروں کے بیچ

سرحدِ مژگاں و ابرو چھوڑ دی
کون ٹھہرے اِن کماں داروں کے بیچ

نقویٔ خستہ پہ رحمت ہو تمہا
وہ بھی بیٹھا ہے سیہ کاروں کے بیچ

۷ر اگست ۷۴ء

○

مانا کہ تیری دید نے حیراں بنا دیا
میں نے بھی تجھ کو جلوۂ جاناں بنا دیا

بس ایک مُو سے ٹوٹ گئے سارے آئنے
عالم کو ہم نے دیدۂ حیراں بنا دیا

اللہ رے صفاتِ الٰہی کا پرتو ا
اک خاک داں کو رشکِ گلستاں بنا دیا

آتی ہے بوئے مُشکِ خُتن میرے جسم سے
تم نے تو مجھ کو رشکِ غزالاں بنا دیا

اب خلفشارِ زیست سے بھی ہم کو پیار ہے
ہم نے اُسے بھی زلفِ پریشاں بنا دیا

دیکھا مجھے چمن میں تو وہ اُٹھ کے چل دیئے
لو میں نے اُن کو سروِ خراماں بنا دیا

اُس پیکرِ جمال سے نظریں جو مل گئیں
اپنے سوا سے ہم کو گریزاں بنا دیا

اُس سرو کو نہ بھائے چمن میں چراغِ گل
داغوں سے ہم کو سروِ چراغاں بنا دیا

ہے اِن دنوں بہار کی ایسی چمن میں دھوم
دامن کو ہم نے اپنے گریباں بنا دیا

گر چاہتے تو کم نگہی سے بھی مارتے
کم ہے کرم کہ ہم کو پریشاں بنا دیا

اک فخرِ عاشقاں کی نظر تم پہ جب پڑی
تم تھے نگار، فخرِ نگاراں بنا دیا

اُن کی نگاہِ لطف کا کیا شکر ہو ادا
ہیں میزباں تھا پر مجھے مہماں بنا دیا

تنہائیوں نے رخصتِ انفاس کی عطا
اک بے وفا کی یاد نے بے جاں بنا دیا

نقوی وفورِ گریہ سے شاداب کر چمن
قدرت نے تجھ کو ابرِ بہاراں بنا دیا

۱۰/۸ اگست ۷۴ء

○

کس کے تنِ رنگیں سے مس ہو کے صبا آئی
بلبل کو ملا امرت، کلیوں کی قضا آئی

نو شمع کی بسمل ہے کچھ منہ سے نہیں کہتی
کیا بات اُسے روحِ پروانہ بتا آئی

خونِ دلِ عاشق سے کف اُن کے نگاریں ہیں
اور لوگ یہ کہتے ہیں کیا خوب حنا آئی

جب تارِ نفس ٹوٹے جب ساز ہو ویراں
تب اُن کی صدا اے دل آئی بھی تو کیا آئی

سب اہلِ چمن جس کو گلزار سمجھتے ہیں
ہم کو تو وہاں بُوئے نقشِ کفِ پا آئی

کیا حبس ہے گلشن میں پتی بھی نہیں ہلتی
یہ کیسی بہار آئی، یہ کیسی فضا آئی

اس زرخیز ماحول میں اُن کے ذاتی اکتساب اور ذوقِ سلیم کو اور بھی چمکنے کا موقع ملا، اُردو ادب اُن کا تعلیمی گہوارہ رہا اور بعد میں تعلیم ادب اُن کا مستقل پیشہ قرار پایا، وہ بیک وقت شاعرانہ وجدان کے ساتھ ساتھ علمی اور تنقیدی بصیرت کے مالک ہیں، اُنھیں شروع ہی سے باضابطہ شاعر ہونا چاہیے تھا' لیکن انھوں نے اپنے اُبلتے اور اُمنڈتے ہوئے شعور کو نامعلوم کن تدبیروں سے عرصۂ دراز تک باندھے رکھا۔ انھوں نے طویل عرصہ تک مضامینِ نو کے انبار جمع کیے لیکن خرمن کے خوشہ چینوں کو بہت دیر میں خبر کی؛ اُن کے دونوں مجموعے نسبتاً کم وقفہ کے ساتھ ظہور پذیر ہوئے ہیں لیکن اُن کی حیثیت وقتی اور مقامی بارش کی نہیں ہے بلکہ ان میں قطرہ سے گہر بننے تک کی طویل ریاضت شامل ہے۔ وہ زندگی اور فن کے متعلق ایسے تجربات' مشاہدات بلکہ فیصلوں پر مشتمل ہیں جن کے پیچھے مفاہمت و مزاحمت کے طولانی نشیب و فراز موجود ہیں۔ ان میں روایت کا ادراک بھی ہے اور عصریت کا شعلہ بھی۔ یہی چیزیں مل کر اُس مخصوص شعلۂ ادراک کی تخلیق و تفہیم کرتی ہیں جو نقوی صاحب کی غزل گوئی میں اپنی پوری تابناکیوں کے ساتھ جلوہ گر ہے۔

زیرِ نظر غزلیں اپنی مخصوص معنوی گہرائی اور اسلوبی تاثیر رکھتی ہیں۔ اُن میں روایتی رجحانات بھی عصری دلکشیوں کے ساتھ نمودار ہوتے ہیں۔ ان غزلوں کے ذریعے سے نہ صرف دلپزیر شاعری سے

لمسِ کفِ نازک سے طوفان ہوا برپا
پھر دل میں لہو دوڑا پھر جاں پہ بلا آئی

ہاں، بادہ کشو! چونکو اب وقت ہے پینے کا
زلفوں کی گھٹا اٹھی، دامن کی ہوا آئی

تقدیر کے ماروں کے دن رات نہیں ہوتے
کب پرتوِ خور پہنچا، کب مہ کی ضیا آئی

نقوی ترے شعروں نے بدنام کیا ہم کو
پیغام حسینوں کے یہ لے کے صبا آئی

۲۲/۲۵ اگست ۷۴ء

آنکھوں سے ہنسی ہونٹوں پہ لائی نہیں جاتی
دل میں وہ لگی ہے کہ بجھائی نہیں جاتی

اُلجھائیں گے کچھ اور خمِ کاکلِ گیسو
دیوانے کو زنجیر پنھائی نہیں جاتی

کیوں جوہرِ ذاتی پہ ہو احسان کسی کا
"مہندی کفِ رنگیں میں لگائی نہیں جاتی"

ہم ہیں کہ مداوائے الم کر نہیں سکتے
تم سے بھی کوئی راہ دکھائی نہیں جاتی

دیوانہ نہ تھا اِس لیے سولی پہ چڑھایا
دیوانوں سے یہ بات بتائی نہیں جاتی

خود آکے تمناؤں کا گھر پھونک دے اک دن
ہم سے تو اِسے آگ لگائی نہیں جاتی

دیوانوں کی ہے بات، ذرا اس کا رہے دھیان
فرزانوں کو یہ بات سنائی نہیں جاتی

جب ترکِ تعلق بھی بنے ایک تعلق
ہاں، ایسی بھی منزل ہے جو پائی نہیں جاتی

وصفِ لبِ رخسار بیاں کرتے رہیں گے
عادت جو پڑی ہے وہ چھڑائی نہیں جاتی

نقوی کو بھی دعوائے اناالحق، مگر افسوس
رسمِ رسن و دار سکھائی نہیں جاتی

۹ ستمبر ۷۴ء

○

اُن کے کوچے اُن کی گلیاں اپنا شغل پُرانا ہے
جانا ہے اور آنا ہے، آنا ہے پھر جانا ہے

دل ہی نہیں جو درد نہ جانے آہ نہیں جو دل میں اُترے
اُس پر کچھ الزام نہیں ہے تو ہی کچھ بیگانہ ہے

ہم نے اپنا سب کچھ کھویا پھر بھی دیوانے کہلائے
اُن سے کہاں اب ڈھونڈنے نکلیں کون یہاں فرزانہ ہے

بھور ہوئی اور گھر سے نکلے رات گئے تک واپس آئے
جنگل ہی میں آبادی ہے گھر گھر اک ویرانہ ہے

دل کے ہاتھوں ایسے جاگے خواب و خور ہے حرام کیا
سر تکیوں پہ ٹپکتے ہیں ہم نیند بس اک افسانہ ہے

اُن کے خلوصِ بے پایاں نے مول لیا ہم کو یارو
قیمت اپنی مل گئی کتنی، اب ہم کو کیا پانا ہے

پل بھر کو کل نیند جو آئی، خواب میں آئے فرمایا
شب بیداری کے شکوے سے تجھے نیند نہ آنا جانا ہے

اک جگ بیتا آنکھ لگی تھی تب سے آنکھ نہیں لگتی
سوتے جاگتے اُن کو ڈھونڈیں پھر بھی پانا جانا ہے

نقوی میر کی چوکھٹ چومو پھر جھک کر یہ عرض کرو
آپ کے کوچے میں در آیا، سمجھیں اک دیوانہ ہے

۱۴ر ستمبر ۷۴ء

○

تجھے اے خاطرِ اندوہ گیں کس طرح بہلائیں
مگر اپنے دلِ گم گشتہ کو پھر ڈھونڈنے جائیں

کسی کی دل رُبائی کی قسم، یاران ہم مشرب
ہزاروں بار دل کھوئیں، ہزاروں بار گر پائیں

نہیں ہے ہم کو ذوقِ تلخ کامی پھر بھی حق یہ ہے
کہاں تک ہم سُنیں آخر، کہاں تک سُن کے پی جائیں

نمودِ گلشنِ عالم ہے اپنی پردہ داری تک
نہاں ہو ہست و بودِ زندگی پردے جو سرکائیں

ہمیں دلداری و مہجوریٔ اُلفت ہیں ہم معنیٰ
کہ گزریں آپ سے یکسر اگر ہم آپ کو پائیں

ہماری ناصیہ سائی سے پھر نقشِ قدم اُبھریں
رواں ہوں رہروانِ شوق پھر جادے جو کھل جائیں

تمیزِ سالک و مسلک مٹانے اہلِ دل نکلیں
مقاماتِ جنوں کی سیر میں سب مل کے کھو جائیں

ہمیں نقدی سے کیا مطلب کہ وہ دیوانہ ہے یعنی
وہ جائے دشتِ اُلفت کی طرف ہم شہر کو جائیں

۱۸ ستمبر ۷۴ء

○

چشمِ مشتاق، اشکِ باریدہ
آئنہ حیرتی و نم دیدہ

ہم نے سمجھا تھا کچھ کھلے گا دل
آئے وہ لیک کتنے سنجیدہ

یہ بہاریں بھی خوب آئی ہیں
گل و بلبل ہیں زار و ترسیدہ

نگہ یار الاماں ، توبہ
بجلیاں ہو دیں جیسے سائیدہ

جان و دل دونوں نذر کر ڈالے
چشم آہو ہے پھر بھی رم دیدہ

بارِ مینا و دستِ نازکِ دوست
شاخ گل ہو گئی ہے لرزیدہ

کیا لُٹی ہے متاعِ ذوق و جنوں
شہر ویران دشت خوابیدہ

قیس و فرہاد، دل شکستہ و زار
حُسن مجبور، عشق کاہیدہ

آج واعظ کا بھی بھرم کھل جائے
اک نظر اُس طرف بھی دُزدیدہ

تیری رفتار یاد آتی ہے
ہر روش ہے نسیم لغزیدہ

نقوی جاں بہ لب پہ رحم کرو
دیکھو، اب پُتلیاں ہیں گردیدہ

۲۳ ستمبر ۷۴ء

○

زہ نظر تیر ہوئی جاتی ہے
دم شمشیر ہوئی جاتی ہے

زُلف زنجیر ہوئی جاتی ہے
خطِ تقدیر ہوئی جاتی ہے

یوں فروزاں ہے جوانی اُن کی
مہ کی تنویر ہوئی جاتی ہے

لاکھ تقصیر سہی عشقِ بتاں
پھر بھی تقصیر ہوئی جاتی ہے

لوگ کہتے ہیں کہ اُن کی تصویر
میری تصویر ہوئی جاتی ہے

اپنی ادراک کی لگاوٹ یارو
شکّر و شیر ہوئی جاتی ہے

روشناسی ہوتی ہے بلکہ یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ نقوی صاحب نے فقط شاعری کے تقاضوں کو نقشِ جمیل میں منتقل نہیں کیا ہے بلکہ ان وسیع تر فرائض کو بھی پورا کیا ہے جو زبان و فن کے سلسلہ میں خود شاعر پر عائد ہوتے ہیں۔ شاعر کے فرائض کے متعلق مشرقی اور مغربی مآخذ جامع نکات اور مفصل بحثوں سے مالا مال ہیں۔ تفصیل میں جائے بغیر اتنا کہہ دینا کافی ہوگا کہ وہ تہذیب کا امین ہوتا ہے اور بدلتے ہوئے تہذیبی مظاہر کے درمیان مشترک اقدار کا رشتہ پیدا کر کے تہذیبی تسلسل کو قائم رکھنے میں مدد دیتا ہے۔ اپنے عہد کے لوگوں کے لطیف احساسات کو آوارہ گرد بننے سے بچاتا ہے وہ جذبہ کے لیے صرف پناہ گاہیں نہیں تعمیر کرتا بلکہ مقتضائے حال کے مطابق ان کی تربیت و تطہیر بھی کرتا ہے اسی طرح زبان کے سلسلہ میں بھی اُس کی ذمہ داری زبان کے دوسرے استعمال کرنے والوں کے مقابلہ میں مختلف اور نازک ہوتی ہے۔ زبان اُس کے لیے تہذیبی تسلسل کا عملی مظہر ہوتی ہے۔ وہ اپنے حقیقی منصب کو پورا نہیں کر سکتا جب تک کہ زبان اور علامتوں کے معنوی اور تہذیبی امکانات کی مسلسل توسیع نہ کرتا رہے اور زبان کی مدد سے مسلسل ایسے پیکر نہ تراشتا رہے جو معاصر مسائل سے زیادہ ہم آہنگ اور مانوس محسوس ہوں۔ لطیف احساسات اور جذبہ کی تشفی کے لیے زبان کی

روز افزوں ہے جمالِ عالم
اب بھی تعمیر ہوئی جاتی ہے

دِل کی بستی کو اُجاڑے تو کوئی
ابھی تعمیر ہوئی جاتی ہے

سُن سکو گر تو مخاطب ہے ازل
اب بھی تقریر ہوئی جاتی ہے

اُن کو آنا تھا عیادت کو مری
بڑی تاخیر ہوئی جاتی ہے

آیتیں عِشق کی ہم کو مانو
ابھی تفسیر ہوئی جاتی ہے

روز اک تازہ بلا نازل ہے
جیسے تقدیر ہوئی جاتی ہے
تیری رنگت کو ہوا کیا نقوی
روز تغیر ہوئی جاتی ہے۔

۲۷ ستمبر ۶۴ء

○

جنت میں بھی وہ غیر کے ہمراہ گر ملے
ہم کس طرح کہیں گے کہ خلدِ نظر ملے

ہم ایسے گم ہوئے ہیں کہ ان کی خبر نہیں
اُن کی خبر ملے تو کچھ اپنی خبر ملے

ہو ربطِ باطنی تو نگہ کیوں ہو درمیاں
کیوں سوچیے کہ اُن کی نظر سے نظر ملے

تسکینِ شوق و ذوقِ نظر تو ہے اور شے
حوروں کی فکر کیوں ہو ہمیں تو اگر ملے

ہم نے تو تیری راہ میں سب کچھ لٹا دیا
پھر بھی نہیں ہے فکر کہ تجھ کو خبر ملے

یارانِ شاد کام و ہوس پیشہ اک طرف
ہم اک طرف کہ لذتِ زخمِ جگر ملے

تاثیرِ صبر و ضبطِ فغاں کام آگئی
ملتے نہ تھے مگر جو ملے کس قدر ملے

اپنا بھی ذکر ہوگا تمہارے فسانے میں
پڑھنا کبھی جو غیر سے تم کو مفر ملے

نقوی خیالِ خام ہے غالبؔ کی ہم سری
ہم کو تو اس غزل میں فریبِ نظر ملے

یکم اکتوبر ۷۴ء

بہت وقت بیتا، بڑی رات گزری
مرے ہاتھ ہارے، تری زلف الجھی

وہ دستِ حنائی، وہ صندل کی شاخیں
رہے ہاتھ ملتے، رہی جی میں جی کی

مگر تشنگی ہے کہ بڑھتی ہی جائے
کسی کی نگاہوں سے گو ہم نے پی بھی

تقاضا مروّت کا جاں اُس کو دے دے
تمنّا کی خواہش کہ مت مر ابھی جی

فقط جیب و داماں کی گر بات ہوتی
تو ناصح سے کہنا کہ کم بخت سی بھی

محبت میں مجھ کو جو سمجھا رہے ہو
کبھی تم نے یارو النظران کی دیکھی

ترے غم کا ہم کو سہارا نہ ہوتا
تو سہتے بھلا کیسے ہم اُونچ نیچ

ہمیں نے تھمے گائے محبت کے نغمے
ہمارے ہی اُوپر پھری ہے چھری بھی

فقط بت تراشی تھا اک شغل اپنا
مگر ترک کرنا پڑی آذری بھی

اُسی کا کرم ہے، اُسی کا تصدّق
کہ "یاروں" سے ہم نے کلہ اپنی کج کی

شریفوں سے سیدھا نہیں سے ترچھا
ترا بانکپن کیا نرالا ہے نقوی

۳ اکتوبر ۷۴ء

○

بس ایک نگاہِ خندہ بہ لب بس ایک چھلکتا جام بہت
جینے کے سہارے ہوں لاکھوں، مرنے کا ہے یہ انعام بہت

زخموں کے چمن کھلتے ہی رہیں ناسورِ جگر رستے ہی رہیں
گلفاموں کی کیوں ہو فکر تمہیں ہم کو ہیں یہی گلفام بہت

خودکاموں کی ہے اک بھیڑ لگی پر دل کی نگر یا سونی ہے
اِس شہر کی آبادی کے لیے مل جائے تو اک ناکام بہت

یہ تارِ گریبان و دامن یہ دل کے پُرزے کیا کم ہیں
تم آؤ نہ آؤ جانِ کرم ہیں اپنے لیے تو کام بہت

یہ شہرِ جنوں ہے عقل سنبھل، یاں سُخنہ کاری بے معنی
اس دار و رسن کی دُنیا کو منصور سا ہے اِک خام بہت

وہ زُلف بکھرے نکلیں تو آئیں تو عیادت کی خاطر
گو زیست نئی اپنی شام سہی پر ایسی ہے اک شام بہت

THIS EBOOK IS DOWNLOADED FROM
SHAAHISHAYARI.COM

LARGEST COLLECTION OF URDU
SHERS, GHAZALS, NAZMS AND EBOOKS.

اے ناصحِ ناداں، روک زباں، تشریحِ گنہ کیا لازم ہے
مجھ رِند کے سُولی دینے کو، اُلفت کا ہے اک الزام بہت

گو وحی کا رشتہ ٹوٹ گیا، پر دل جو کدورت دور کرے
آئینے میں عکسِ باطن سے بندوں کے لیے پیغام بہت

یہ جوشِ جنونِ عشق بھلا کب نچلا بیٹھنے دیتا ہے
مجنوں کے لیے صحرا لاکھوں، فرہاد کو اپنا کام بہت

ہے جنگل جنگل گونج اپنی اور شہروں شہروں چرچا ہے
ارباب خرد پھر بھی یارو، سمجھے ہیں ہمیں گمنام بہت

اِن حرص و ہوس کے ماروں سے کیا تیرا تعلق اے نقوؔی
اِن کو دلِ نافرجام بہت اور تجھ کو دلِ ناکام بہت

۲۲ر اکتوبر ۷۴ء

○

اگر قدم نہ محبت کا درمیاں ہوتا
تو پھر زمین ہی ہوتی نہ آسماں ہوتا

کشاکشِ غمِ اُلفت کا امتحاں ہوتا
تو کیا کہوں کہ میں اس راہ میں کہاں ہوتا

وفائے غیر کا کب تک نہ امتحاں ہوتا
نہ ہوتا یہ، تو محبت میں میں کہاں ہوتا

بلاکشانِ مقدر کہاں نکل پاتے
اگر زمین نہ ہوتی تو آسماں ہوتا

میں جانتا ہوں کہ تیوری بدل کے دیکھا کیوں
رقیب ہوتا تو ایسے میں بدگماں ہوتا

نہیں ہے تاب و تواں بارِ غم اُٹھانے کی
مگر تمہارا کرم بھی جو درمیاں ہوتا

جہاں جہاں تجھے دیکھا نظر نے سجدے کیے
یہ کوئی حد تھی تری میں کہاں کہاں ہوتا

یہ اعتبارِ جنوں تھا کہ بوالہوس بھی بجے
بھری خدائی میں کس کس کا امتحاں ہوتا

چمن بہار کے جھونکوں سے پاش پاش ہوا
خزاں کی گود میں گر میرا آشیاں ہوتا؟

غضب ہوا کہ ہوئے مائل کرم وہ بھی
کوئی تو اہلِ وفا کا مزاج داں ہوتا"

تری زباں پہ ہے ہر دم انا انا نقوی
تو ہی بتا کہ ترا کون رازداں ہوتا

۲۳/۲۴ اکتوبر ۷۴ء

اہلیت مسلسل قائم رکھنا بلکہ اُس میں اضافہ کرنا شاعر کے اہم فرائض میں ہے۔ اگر کثرتِ استعمال اور عاداتِ تکلم کے متواتر عمل سے الفاظ اور تعبیراتِ معنوی اعتبار سے سانچہ بند ہو جائیں تو شاعر ہی کو ان میں نئی پالیدگی کی روح پھونکنا چاہیے ایسی چیز کو بعض نقادوں نے کنایات و تشبیہات کی نئی آرائش یا مُردہ استعاروں کا احیاء کہا ہے انھیں اسباب و تقاضوں کی بنا پر اکثر شاعر اس پر بھی مجبور ہوتا ہے کہ وہ متروک الفاظ و تعبیرات کا جیسا کہ خود اس مجموعہ میں نظر آئے گا اپنی شاعری میں کبھی کبھی اعادہ کر کے خوابیدہ احساس کو جگا دے۔ نقوی صاحب نے ان فرائض کی تکمیل کے سلسلہ میں شاعر اور معلم دونوں ہی کے نقطۂ نظر کو سامنے رکھا ہے۔ اُنھوں نے اُس تہذیب کی نئی چمن بندی کی جس کی مُدتِ دراز سے غزل نمائندہ کہی جاتی ہے انھوں نے اُن احساسات و جذبات کی اچھی نمائندگی کا اہتمام کیا ہے جنھیں نیا اُردو سماج عزیز رکھتا ہے۔ اُن کی غزلوں کا مجموعی لفظی اور معنوی آہنگ جذباتی تسکین اور فطری تطہیر کے علاوہ اُن دلپذیر اور معنی خیز اشاروں پر مشتمل ہے جو شاعرانہ انفرادیت اور عہدِ حاضر کے سماجی اور تہذیبی تقاضوں کی مختلف سمتوں اور رجحانات کو نہ صرف سمیٹے ہوئے ہیں بلکہ انھیں سمجھانے کا فرض بھی انجام دیتے ہیں۔

○

کبھی تھا نقوشِ بہکیں بھی اک گلستاں سا
مگر جو دیکھیے اب تو ہوا بیاباں سا

جنونِ عشق ہے، پریاں اُڑائے پھرتی ہیں
دیارِ شوق میں عاشق بھی ہے سلیماں سا

تمہارے تیرِ نظر سے کھلے دلوں کے چمن
تمام عالمِ امکاں ہوا نمکداں سا

قفس کا در جو کھلا، بازوؤں میں زور نہیں
قفس نصیبوں پہ چھایا ہے اب بھی زنداں سا

بہار وہ ہے کلی دل کی جس سے ہو خنداں
ہوا کرے جو یہ عالم ہے اک بہاراں سا

تمھیں خبر ہے کہ دل پر کسی کے کیا گزری
برنگِ آئنہ ساکت ہے اور حیراں سا

جو دیکھے داغ مرے دل کے رہ گئے ششدر
سمجھ رہے تھے کہ بس ہو گا اک چراغ سا

خبر اُڑی کہ وہ گزریں گے مرے کوچے سے
تمام راہ کا عالم تھا نرگستاں سا

۳۱ر اکتوبر و یکم نومبر ۷۴ء

○

اُسے کیا خبر کسی کے دل و جاں پہ کیا تعب ہے
کوئی کاش جا کے کہتا کہ مریض جاں بلب ہے

دل ناتواں رُکا ہے جو کسی سے اے عزیزو
تمہیں کس لیے خلش ہے کہ بتاؤں کیا سبب ہے

مرا غم تو غم ہے اپنا تمہیں کیوں ہو فکر اتنی
مرے غم پہ بندشیں کیوں مرا گریہ بے سبب ہے

تجھے عقلِ مصلحت ہیں تو ہزار بار لوٹ کے
مگر اے سفینۂ دل تجھے ڈوبنے کا ڈھب ہے

یہ جہانِ مرغ و ماہی تو نہیں ہے دل کی منزل
نکل اس کی سرحدوں سے تجھے اُسکی گر طلب ہے

یہ فغانِ صبح گاہی کہ بصیرت آفریں ہے
اسے پیار کر کے دیکھو تو کشادِ روز و شب ہے

یہ جھکی جھکی سی نظریں یہ کھلے کھلے سے گیسو
ذرا بات کر کے دیکھیں کہ مزے کا وقت اب ہے

ستم و کرم نما کی نہیں کوئی حد جو اے دل
کرم و ستم نما بھی تو تجھی پہ روز و شب ہے

یہ کدھر سے شور اُٹھا ہوا کون اب روانہ
ذرا دیکھنا تو نقوی یہ وداع کس کا اب ہے

۱۱ / نومبر ۷۴ء

○

جب سے میں ہو گیا ہوں دیوانہ
سارا عالم ہے اک پری خانہ

جلوۂ عشق بھی نہیں کچھ کم
اُن کا پرتو ہو لاکھ جانانہ

بزم سے اُٹھ کے ہم چلے آئے
رہ گئی آبروئے پروانہ

اپنی اپنی سمجھ کی باتیں ہیں
کون فرزانہ، کون دیوانہ

عشق سے موت کو ہے کیا نسبت
وہ حقیقت، یہ ایک افسانہ

جس کو دیکھو وہ تم پہ مرتا ہے
کبھی دیکھا کسی کا مرجانا؟

جب سے جلوہ فگن ہے وہ دل میں
یہ خرابہ بنا ہے گل خانہ

ابر زلفوں کا، مدھ بھری آنکھیں
کیسا موسم ہے، کیسا مے خانہ

نقوی مبتلا خموش ہوا
وہ یہ کہتے رہے کہ مرجانا

۱۱/۱۲ نومبر ۷۴ء

○

زلفِ دراز و دوش پہ ڈالے ہوئے تو ہیں
یعنی کمندِ ناز سنبھالے ہوئے تو ہیں

آنکھوں کی خوں فشانی ہوئی کچھ تو کارگر
گل رنگ چشمِ ناز کے ہالے ہوئے تو ہیں

پھر کاروبارِ شوق کے عنواں نظر میں ہیں
صد شکر، زخمِ دل مرے آلے ہوئے تو ہیں

اے کاش دستِ شوق کو راس آئے ربطِ زلف
کالے کو آستین میں پالے ہوئے تو ہیں

ہنگامۂ حیات فزوں تر ہو دوستو!
کچھ کچھ اُفق پہ سُرخ اُجالے ہوئے تو ہیں

کیا رُک سکے گی روکے سے تحریرِ انقلاب
زنجیرِ پائے خامہ میں ڈالے ہوئے تو ہیں

اب ڈگمگا کے گرنے کو ہے قصرِ زرگری
تلبیس و زور لاکھ سنبھالے ہوئے تو ہیں

ہیا ہو نہ ہم سے اور نشانِ خلوصِ مہر
یاروں کو آستین میں پالے ہوئے تو ہیں

فقہی کی زد سے بچ کے کہاں جائیں گی مگر
تاریکیاں پروں کو سنبھالے ہوئے تو ہیں

۱۹/۲۱ نومبر ۷۴ء

○

تارِ گیسو ہیں مرے تارِ رگِ جاں کے قریب
چارہ گر، دیکھ، الجھنا نہ گریباں کے قریب

اپنی واماندگیٔ شوق کی شوخی دیکھو
تھک کے بیٹھے بھی کہاں منزلِ جاناں کے قریب

چاکِ دل، چاکِ جگر، چاکِ گریباں ہیں سجے
کچھ خریدو نہ مگر آؤ تو ساماں کے قریب

سایۂ ابرِ بہاراں میں بھی دم گھٹتا ہے
کس لیے بیٹھے تھے ہم آپ کے داماں کے قریب

راہِ تسلیم و رضا سخت بھی ہے، آسان بھی
دیکھیں کیا گزرے پہنچ کر کسی داماں کے قریب

نہ پھرا خضر کی مانند اُڑاتا ہوا خاک
جو کوئی بیٹھ گیا تیرے شبستاں کے قریب

ہائے پابستۂ زنجیرِ محبّت، یارو
بیڑیاں ٹوٹی پڑی ہیں درِ زنداں کے قریب

بُلبُلو، مل کے دعا مانگو خدا خیر کرے
کچھ دھواں سا نظر آتا ہے گلستاں کے قریب

نقویؔ غم زدہ ایسا نہ ہو تو جل اُٹھے
دیکھ، جانا نہ کبھی میر کے دیواں کے قریب

۲۲/۲۳ نومبر ۷۴ء

گوناگوں اچھے اوصاف کے علاوہ یہ غزلیں بالخصوص اپنے انفرادی مزاج کی طرف بھی متوجہ کرتی ہیں۔ اِن میں نہ صرف عہدِ حاضر کی مزاجی کیفیت اور مطالبات کی عکاسی ملتی ہے بلکہ خود نقوی صاحب کے مزاج کی بھی خوش گوار جھلکیاں ملتی ہیں۔ نقوی صاحب سے جو لوگ واقف ہوں گے انھیں کچھ بتانے کی ضرورت نہیں ہے، وہ اُن کی کج کلاہی، آن بان، اور خوش طبع استقامت، باغ و بہارانا، اعتماد سے بھرپور انسانیت اور دوست نوازی کے جذبہ کا بارہا تجربہ کر چکے ہوں گے۔ نقوی صاحب نے ہمیشہ پُرسوز دل اور پُرعزم نگاہ کے ساتھ زندگی اور اس کے مسائل سے چیلنج کی لین دین کی ہے اور بشمول غزل ہر معرکہ میں عزتِ، سادات، کو سربلند رکھا ہے۔ ان کی غزلیں بھی اُسی کج کلاہی کا مظہر ہیں اِن میں اعتماد، حوصلہ اور زندگی کے مسائل کو عزم کے ساتھ جھیلنے اور طے کرنے کی معروضی کوششوں کا شاعرانہ اظہار ملتا ہے۔ اپنے فن میں وہ توانائیوں کے نقیب نظر آتے ہیں نہ کہ مراعات کی دریوزہ گری کرتے، ان کی غزلوں کا یہ مزاج اپنی مخصوص افادیت اور خوشگواری کے علاوہ اُس سمت اور شاہراہ کی طرف بھی اشارہ کرتا ہے جس پر فی الحال کاروانِ غزل گامزن ہو کر اپنے وجود و مقصد کی زیادہ اچھی حفاظت کر سکتا ہے۔

○

نہ مدعی، نہ کوئی مُدّعا لگے ہے مجھے
عجیب رنگ کی دل میں فضا لگے ہے مجھے

بُرا نہ مانو تو تم سے میں ایک بات کہوں
یہ گفتگو کا طریقہ بُرا لگے ہے مجھے

ہزار جُرم پہ بھی ہے مرا کرم فرما
میں کیا بتاؤں کہ وہ شوخ کیا لگے ہے مجھے

وہ خوب رو بھی ہے، دلبر بھی اور دل آرا بھی
مگر وہ شوخ کچھ اس سے سوا لگے ہے مجھے

میں چھیڑتا ہوں اُسے اور وہ کوسنے دے ہے
مگر یہ کوسنا جیسے دعا لگے ہے مجھے

جو پاس آن کے بیٹھے چمن سا کھل جائے
چلے تو جنبشِ بادِ صبا لگے ہے مجھے

خرامِ بادِ صبا لاکھ گل فشاں ہو جائے
کسی کی چال کی جھوٹی ادا لگے ہے مجھے

یہ لالہ و گل و نرگس، یہ ابر و بادِ چمن
کسی کے جسم کی اُتری قبا لگے ہے مجھے

تمام آسرے بیکارِ محض ہیں نقوی
اُسی کا آسرا بس آسرا لگے ہے مجھے

۲۴/۲۵ نومبر ۷۴ء

○

وہی ہمیں نظر آئیں، جدھر جدھر دیکھیں
بتا تو اے دلِ حیراں کدھر کدھر دیکھیں

کسی کی بزم میں ہم اس طرح سے بیٹھے ہیں
کہ لوگ دیکھیں اُنھیں، ہم نظر نظر دیکھیں

تری نظر نے تراشے ہیں دل میں لاکھ ہلال
ملائیں گر شبِ غم میں، قمر قمر دیکھیں

جگر تو سب کو ملے ہیں، یہ تیر کھائے گا کون
ذرا نگاہ کریں تو۔ جگر جگر دیکھیں

نہ دیکھیں اُن کی نگاہیں تو کوئی بتلائے
کہ روز حالتِ دل کیسے ہم بتر دیکھیں

شکر لبی و شکر خندگی کا کیا کہنا
کہ بزمِ عالم امکاں، شکر شکر دیکھیں

مگر یہ دورِ خرد بھی عجیب ہے نقوی
دل و جگر کو بھی اس میں دگر دگر دیکھیں

۲۷ر نومبر لغایۃ یکم دسمبر ۷۴ء

ل

باری آساں ہوگئی مشکل کھینچے تھے آزار بہت
دل کے ہاتھوں کیا کیا جھیلا برسوں رہا بیمار بہت

جب بھی لب کھولے ہیں ہم نے مہکے ہیں گلزار بہت
جن کلیوں کے چہرہ تھا دل میں کھٹکے ہوں گے خار بہت

ساری نگری چھانتے گزری پاپڑ بیلے تھک ہارے
مہر و وفا کا ذکر نہ پایا اوچھے کا سا پیار بہت

عشق کی تپتی دھوپ سے اُس کو کون بچاتا اے یارو!
سایۂ زلفِ یار کو ترسی گرتی ہوئی دیوار بہت

قصرِ محبت کیا بن پاتا ہوش و خرد کے ماروں سے
یوں تو کہنے کو یارو! تھے ہم جیسے معمار بہت

پیار کی باتیں سب کرتے ہیں پیار کی ہمت کس میں میاں
پیار کی راہ میں آگ سی برسے بسترِ گل پر خار بہت

اُن کی نگاہیں جس نے دیکھیں اُن کا مُداوا ہو نہ سکا
نرگسِ شہلا تو ہی نہیں ہے ہم بھی تو ہیں بیمار بہت

آئنہ حیراں، زلف پریشاں، آنکھیں بے کل، جاں بے چین
مت گھبرا تو اے دلِ وحشی تیرے بھی ہیں غمخوار بہت

ناز کرو مت جور و جفا پر آئینے میں مُنہ تو دیکھو
یاد رکھو تم جیسے ہم نے دیکھے ہیں دلدار بہت

آنا کانی، ہنسنا، رونا، دم دینا، چُپ ہو جانا
حسنِ لطافت لاکھ دکھائے عشق پہ تو ہے بار بہت

نقوی سادہ ساتھ ہوا ہے ایسے سادہ کاروں کا
جن سے حرص و ہوس کے ایواں پائے ہیں نقش و نگار بہت

۲۹ نومبر بغایتہ یکم دسمبر ۷۴ء

○

غم اس قدر عزیز ہوئے جان ہو گئے
آئے تھے چند لمحوں کو، مہمان ہو گئے

تعبیرِ خواب شوق ملی اس طرح کہ ہم
اُن کی نگاہ ناز کے قربان ہو گئے

حیرانیوں پہ اپنی بہت ناز تھا انھیں
دیکھا مجھے تو آئنے حیران ہو گئے

اُس منفعل نگاہ کے اُٹھتے ہی اہلِ دل
اپنی نگہ میں آپ پشیمان ہو گئے۔

صد شکر، شام ہی سے ہیں آنکھوں میں اشکِ غم
پھر تا لبِ نگاہ کے سامان ہو گئے

اس درجہ دلفریب مری فردِ جرم تھی
لکھ کر اُسے فرشتے بھی حیران ہو گئے

پڑھتے ہیں کیوں یہ کلمہ کسی بُت کا بار بار
نقوی، ذکا ضرور مسلمان ہو گئے

نوٹ - ۳۱ دسمبر ۷۴ء کو یہ غزل فی البدیہہ کہی گئی اور اس طرح کہ مطلع کے بعد کے دو شعر میں نے کہے اور بقیہ اشعار کے پہلے مصرعے عزیزی پروفیسر ذکا صدیقی صدر شعبۂ فارسی رضا کالج نے مہیا کیے ذکا صاحب اب سعودی عرب میں مقیم ہیں۔
نقوی ۲۰/۸/۷۷

○

ہم نے اک خوب رُو سے پیار کیا
بے سبب رنج اختیار کیا

بے محابا ملے وہ محفل میں
ہم پہ کس درجہ اعتبار کیا

دل و جاں وار کر یہ سوچتے ہیں
تھا ہی کیا ہم نے جو نثار کیا

اے تلوّن مزاج کیا کہنا
کھنچ گیا کتنا، کتنا پیار کیا

تیرے "ایفائے عہد تک نہ جیے"
موت کا ہم نے اعتبار کیا

بے دماغوں سے بے دماغ رہے
سَر بلندوں سے افتخار کیا

بزمِ احباب میں نیاز گزار
دُشمنوں سے بھی انکسار کیا

غمِ جاناں کی پردہ پوشی کو
غمِ دوراں بھی اختیار کیا

معصیت کارِ شوق تھا نقوی
کیسا واعظ کو غم گسار کیا

۱۲ فروری ۶۵ء